جلد ۱۱ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۹۹ء رمضان ۱۴۱۹ھ

فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	محمد بلال	۲

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۸-۱۶ (۳)	جاوید احمد غامدی	۶

معارف نبوی

جنتی آدمی	طالب محسن	۱۰
استقامت	طالب محسن	۱۳
عید کی نماز	طالب محسن	۱۶
عید کی خوشی	طالب محسن	۱۹

دین و دانش

اسلام اور تصوف	جاوید احمد غامدی	۲۲
اصول و مبادی (۸)	جاوید احمد غامدی	۴۷
قانون معیشت (۴)	جاوید احمد غامدی	۵۰
التزام جماعت ــــ اعتراضات کا جائزہ (۱)	معز امجد	۶۵

مناجات

خواب میں ڈر جانے کی دعا	ساجد حمید	۷۳
لیلۃ القدر پانے پر دعا	ساجد حمید	۷۵

اصلاح و دعوت

شکایت	طالب محسن	۷۷

ادبیات

پرستش (رپورتاژ)	طالب محسن	۷۹
''اپر کلاس'' کی باتیں (رپورتاژ)	محمد بلال	۸۱
غزل	جاوید احمد غامدی	۸۴

اس شمارے میں

رمضان المبارک کی رات تھی۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد میں نمازِ تراویح ادا کی جا رہی تھی۔ نماز پڑھانے والے امام صاحب کی قراءت صرف مقتدی حضرات ہی کو نہیں بلکہ لاؤڈا سپیکر کے ذریعے سے پورے محلے کو بھی سنائی جا رہی تھی۔ اس مسجد کی ہم سائیگی میں میرے ایک دوست رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب بہت دور ملازمت کرنے جاتے ہیں اس لیے وہ صبح سویرے گھر سے چلے جاتے ہیں اور شام ڈھلنے کے بعد گھر لوٹتے ہیں۔ اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ عشا کے بعد جلد سو جائیں۔ لیکن اس مسجد کے اسپیکر کی وجہ سے وہ ایسا کر نہیں پاتے، جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اتنے غصے میں آجاتے ہیں کہ مسجد کی انتظامیہ کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

میں اس دوست کو لے کر مسجد میں گیا۔ مسجد کی انتظامیہ کے ایک صاحب کو ایک گوشے میں لے گیا اور انھیں مسئلے کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اور انھیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ نمازِ تراویح فرض نماز نہیں ہے، جو اسے ادا نہیں کرتا خدا اس پر گرفت نہیں کرے گا۔ یہ طریقہ تو فرض نماز میں بھی اختیار نہیں کرنا چاہیے اور آپ ایک نفلی نماز کی قراءت زبردستی محلے کے لوگوں کو سنا رہے ہیں۔ آپ کے ہمسائے آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور دینی اعتبار سے یہ آپ کے لیے بڑی سنگین بات ہے۔ پھر میں نے انھیں وہ حدیث سنائی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ خدا کی قسم کھا کر اس شخص کو ایمان سے خارج قرار دیا تھا جو اپنے ہمسایے کو ایذا پہنچاتا ہے۔ ان صاحب نے معمولی سی بحث کی لیکن تھوڑی دیر کے بعد مثبت رویہ ظاہر کر کے چلے گئے۔

چند دنوں کے بعد مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ اس مسجد کی انتظامیہ کے ایک دوسرے رکن نے میرے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ شخص تو قرآنِ مجید کا مخالف ہے۔ قرآن کی قراءت کرنے کے خلاف بولتا ہے۔

اسی طرح ہمارے ہاں ایک مکتبِ فکر کی مساجد میں اذان سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جاتا ہے۔ ان حضرات کے اس عمل پر تنقید کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو دین دیا، وہ مکمل دین ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں اضافہ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے نامکمل سمجھتا ہے۔ اور یہ

بڑی جسارت ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں اضافے کو بدعت قرار دیا، بدعت کے مرتکب کو جہنمی کہااور اس گناہ کی سنگینی کو ایک دوسرے پہلو سے واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ بدعتی کی تمام عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، انفاق قبول نہیں ہوتیں۔ بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔ تو آپ اذان سے پہلے درود نہ پڑھیں اس لیے کہ یہ دین میں ثابت نہیں ہے۔ اب اس مکتبِ فکر کے حامل جب کہیں ان تنقید کرنے والوں کو ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو درود کے منکر ہیں۔

یہ واقعات ہماری مذہبی دنیا میں ایک معمول کی بات ہے۔ یعنی اختلاف کرنے والے کے نقطۂ نظر کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں جاتا، اصل اختلافی نکتے کو سامنے رکھا نہیں جاتا، استدلال پر غور کیا نہیں جاتا اور بات کو سیاق و سباق سے ہٹا کر بالکل ایک نیا مفہوم پہنا دیا جاتا ہے۔ اور اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایسے اسالیب اور الفاظ اختیار کیے جاتے ہیں کہ سننے والے اختلاف کرنے والے سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور اس معاملے میں صورتِ حال اس وقت اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے جب عام لوگوں کے علاوہ علماے دین بھی ایسی ہی روش اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تصوف کے بارے میں اہلِ ''اشراق'' کی رائے افسوس ہے کہ عوام و خواص نے ٹھیک طرح سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اس معاملے میں ہم پر جو حضرات تنقید کرتے ہیں وہ ہمارے اصل اختلافی نکتے کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے ہمارے بارے میں بعض حلقوں میں بے جواز گریز پیدا ہو جاتا ہے۔

اس وقت جاوید احمد صاحب غامدی کا ایک تفصیلی مضمون ''دین و دانش'' کے ذیل میں، بعنوان ''اسلام اور تصوف'' شائع کیا جا رہا ہے۔ جاوید صاحب نے اپنی اس تحریر میں تصوف کے فکر و فلسفہ پر اپنے اعتراضات بڑی صراحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ ہم جب بھی تصوف پر تنقید کرتے ہیں تو تصوف کے قائل ہمیں صوفیہ حضرات کی وسیع القلبی، نرم مزاجی اور اخوت و محبت کے واقعات سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اہلِ تصوف کے یہ وہ اوصاف ہیں جن کے ہم بھی معترف ہیں۔ مذکورہ تحریر تصوف پر ہمارے اعتراض کے اصل نکتے پر مبنی ہے۔ ہم اختلاف کرنے والوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں جب کہیں ہمارا ذکر کریں یا کوئی جواب دیں تو از راہِ کرم ہمارے اس نکتے کو پیشِ نظر رکھیں۔

''التزامِ جماعت'' کے عنوان سے معز امجد صاحب کی ایک تحریر ''اشراق'' ۱۹۹۸ میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ اس تحریر میں معز صاحب نے التزامِ جماعت کے بارے میں اپنا موقف مثبت طور پر واضح کیا ہے۔

التزامِ جماعت کے بارے میں بعض حضرات ہمارے موقف پر اعتراض کرتے ہیں۔ ''التزامِ جماعت ــــ اعتراضات کا جائزہ'' کے عنوان سے معز صاحب نے ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے جس میں ان اعتراض کرنے والے حضرات کے علمی نکات کی کمزوری واضح کی ہے۔اس مضمون کی پہلی قسط اس وقت شاملِ اشاعت ہے۔

بعض لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ ''اشراق'' میں ''التزامِ جماعت'' کے مسئلے پر اتنا کیوں لکھا جارہا ہے۔اس ضمن میں عرض ہے کہ التزامِ جماعت کا مسئلہ موجودہ حالات میں ہمارے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں کسی غلط رائے سے بڑے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ التزامِ جماعت سے متعلق روایات کو سمجھنے میں ہمارے ہاں لوگوں کو بڑی غلطی لگی ہے۔ مختلف مذہبی جماعتوں کے بانی اور لیڈر اپنی جماعت کا تعلق التزامِ جماعت کے بارے میں احادیث سے قائم کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم وہی جماعت ہیں جس کے التزام کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اور پھر وہ تمام حقوق جو شریعت کی رو سے اس جماعت کے امیر کو حاصل ہوتے ہیں، اپنی ذات کے ساتھ خاص کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کے باعث سادہ لوح افراد ان جماعتوں میں عدم شمولیت کو جاہلیت (کفر) سمجھنے لگتے ہیں۔اور ایسی جماعتوں کے لیے اپنا تن من دھن وارنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔اس طرح ایک ریاست میں مزید ''ریاستیں'' وجود میں آ رہی ہیں اور ایک امیر المومنین کے ہوتے ہوئے کئی ''امیر المومنین'' بن رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔اس مسئلے کے بطن سے کل وطنِ عزیز میں انارکی اور طوائف الملوکی جنم لے سکتی ہے۔ اور جہاد کے نام پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں ہی کے خلاف خون ریزی شروع ہو سکتی ہے۔اس صورتِ حال میں التزامِ جماعت سے متعلق صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس ضمن میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔

''معارفِ نبوی'' میں مشکٰوۃ المصابیح کی ترتیب وار شرح اور ''مناجات'' میں دعاؤں اور اذکار میں ''اشراق'' دسمبر ۱۹۹۸ کے خصوصی شمارے کے باعث تعطل آ گیا تھا۔ اس وقت یہ سلسلے حسبِ روایت موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عید سے متعلق دو احادیث اور لیلۃ القدر کے بارے میں ایک دعا کا انتخاب موقع کی مناسبت سے خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔

''ادبیات'' کے ذیل میں دو تحریریں ایک نثری ادبی صنف رپورتاژ کے ضمن میں شاملِ اشاعت ہیں۔ تنقید نگار بتاتے ہیں کہ رپورتاژ، رپورٹنگ ہی کی ایک قسم ہے۔ رپورٹنگ کا تعلق صحافت سے ہے لیکن رپورتاژ

کا تعلق صحافت کی نسبت ادب سے زیادہ ہے۔ رپورتاژ در حقیقت اپنے مشاہدات، تجربات اور حادثات کی ایسی روداد ہے جس میں خارجی اور داخلی دونوں عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ یعنی رپورتاژ لکھنے والا ایک تو ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو اس نے خود دیکھے ہوں یا اس کی ذات پر بیتے ہوں، دوسرے اس واقعہ کا اس کے دل ودماغ پر کیا اثر ہوا، اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح اس تحریر میں لکھنے والے کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے اور تیسرے اس واقعہ سے متعلق دوسرے افراد کے تاثرات لکھتا ہے اس کے علاوہ اس صنف میں لکھنے والا اپنے اظہار میں تخیل کے زور پر ایک حد تک رنگ آمیزی بھی کر سکتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو اسے ایک ادبی صنف بناتی ہیں۔

یہاں روداد نویسی اور رپورتاژ میں موجود باریک فرق واضح کرنا ضروری معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے لیے ہم روداد کے بارے میں اہلِ فن کے مقرر کردہ کچھ آداب بیان کرتے ہیں جن سے مذکورہ فرق آپ سے آپ واضح ہو جائے گا۔ روداد کسی جلسے یا کسی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال یا کسی اجلاس کی کارروائی بیان کرنا ہے۔ روداد کی زبان سادہ اور منطقی ہوتی ہے۔ وہ رپورتاژ کی زبان کی طرح پر تکلف ادبی اسلوب کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں لکھنے والے کے لیے کسی مسئلے میں اختلاف کے باوجود اپنا ذاتی نقطۂ نظر، تاثر یا تبصرہ شامل کرنا، شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

''قرآنیات'' کا سلسلہ حسبِ روایت موجود ہے البتہ ''یسئلون'' اور ''افاداتِ اصلاحی'' کے سلسلے ''دین و دانش'' کے بعض طویل مضامین کے باعث شائع نہیں کیے جا سکے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

اور انھی لوگوں [۱۵] میں وہ بھی ہیں [۱۶] جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو مانا ہے اور قیامت کے دن کو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵۔ یعنی انھی یہود میں۔

۱۶۔ اس سے مراد وہ منافقینِ یہود ہیں جو اسلام کی کھلی مخالفت کے بجائے اس کے اور یہودیت کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی مخالفت مصلحت اندیشی اور مصالحت پسندی کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اپنے زعما کے طریقے پر یہ اسلام کے مقابلے میں مجرد انکار اور ضد کی پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقے پر قائم رہتے ہوئے اسلام سے موافقت پیدا کی جا سکتی ہے، کی جائے۔ چنانچہ یہ اللہ اور آخرت پر اپنا ایمان مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے اور ان سے یہ چاہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنے لیے بے شک پیغمبر مانیں، لیکن یہود کے لیے آپ کو اپنا پیغمبر ماننے کا مطالبہ وہ ان سے نہ کریں اور اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے دین داری اور خدا پرستی کا ایک مقام ان کے لیے بھی تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کفر و ایمان کی جو کشمکش یثرب میں پیدا کر دی گئی ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور دونوں فریق امن و سلامتی کے ساتھ وہاں رہ سکیں گے۔ اسی لحاظ سے یہ

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ

بھی[17] دراں حالیکہ وہ اصلاً اِن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں مانتے۔[18] وہ اللہ اور اہلِ ایمان، دونوں کو فریب دینا چاہتے ہیں[19] اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔[20] ان کے دلوں میں (حسد کی) بیماری تھی تو اللہ نے (اب) اِن کی اس بیماری کو اور بڑھا دیا ہے،[21] اور ان کے اس جرم کی پاداش میں کہ یہ جھوٹ بولتے رہے ہیں، اِن کے لیے ایک بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے اس رویے سے) تم اس سرزمین

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اپنے اس طرزِ عمل کو اصلاح کی کوشش سے تعبیر کرتے تھے۔

۱۷۔ یعنی یہ دونوں باتیں ہم مانتے ہیں، لہٰذا اس پر مزید کسی ایمان کا تقاضا تم کو ہم سے نہیں کرنا چاہیے۔

۱۸۔ اس لیے کہ وہ اگر خدا اور آخرت پر فی الواقع ایمان رکھتے ہوتے تو حق کے معاملے میں یہ منافقانہ طرزِ عمل کبھی اختیار نہ کرتے۔

۱۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'یخادعون اللّٰہ'۔ 'مخادعة' کے معنی کسی کو دھوکا دینے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ غور کیجیے تو 'خدع' کے مقابلے میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اُس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔

۲۰۔ یعنی اس کا نتیجہ چونکہ ابھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس لیے یہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کہ خدا کو دھوکا دینے کی کوشش میں یہ خود دھوکا کھا رہے ہیں۔

۲۱۔ یعنی انھیں اس بات پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے بنی اسمٰعیل کو کیوں نوازا ہے۔ پھر جب اسلام اور اس کی برکتوں میں روز بروز ترقی ہوئی تو ان کا یہ حسد اور بڑھ گیا، یہاں تک کہ اس نے اِن کو بالکل تباہی کے کنارے پر پہنچا کر چھوڑا۔

اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ
النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا

میں فساد پیدا نہ کرو[۲۲] تو جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔[۲۳] خبردار، یہی فسادی ہیں، لیکن اِس کا احساس نہیں کر رہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح (تمھارے سامنے) یہ لوگ[۲۴] ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کیا اِن احمقوں کی طرح ایمان لائیں؟ سن لو، یہی احمق ہیں، لیکن نہیں جانتے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا،[۲۵] اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں کے پاس پہنچتے ہیں[۲۶] تو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۲۔ یعنی حق کی گواہی دینے کے بجائے حق و باطل میں التباس سے تم اللہ کے پیغمبر پر ایمان کی راہ میں رکاوٹ بن کر اس سر زمین میں فساد پیدا کرنے والے نہ بنو۔

۲۳۔ ان کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ دو فریقوں میں مصالحت کی جو پالیسی ہم نے اختیار کی ہے، تم اسے فساد قرار دیتے ہو، دراں حالیکہ اصلاح اگر ہو سکتی ہے تو ہمارے اس طریقے کو اختیار کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

۲۴۔ یعنی یہ انصار و مہاجرین۔

۲۵۔ یہود اس بات سے مسلمانوں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر رہے ہیں، لیکن اپنے دل میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ اگر آپ کو مان رہے ہیں تو ان امیوں ہی کے لیے اللہ کا رسول مان رہے ہیں۔ رہے وہ تو اُن کے لیے اُن کے اپنے نبی اور اپنے صحیفے ہی کافی ہیں، وہ اس دائرے سے باہر کسی ہدایت کو ماننے کے مکلف نہیں ہیں۔

دور حاضر میں بھی یہود و نصاریٰ میں سے جو لوگ اسلام لائے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں اسی مفہوم میں کرتے ہیں۔

۲۶۔ اصل میں 'خلوا الی' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'خلا' کے بعد 'الی' کا تقاضا ہے کہ اسے کسی ایسے فعل پر متضمن مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ لفظ

اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾

کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور اپنے (قانون کے مطابق) اِن کی سرکشی میں اِن کی رسی دراز کیے جاتا ہے،[٢٧] یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی ہیں جنھوں نے ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دی[٢٨] تو ان کا یہ سودا ان کے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوا اور نہ یہ کوئی راستہ کہیں پا سکے ہیں۔[٢٩] ٨-١٦

'شیطان' اس آیت میں یہود کے لیڈروں کے لیے بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے، جس طرح یہ لفظ ہم اردو میں اس طرح کے مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔

٢٧۔ اوپر اللہ کے جس مذاق کا ذکر ہوا ہے، یہ اسی کی وضاحت ہے۔ یعنی وہ سرکشی میں جتنا آگے بڑھ رہے ہیں، اللہ اسی کے حساب سے اُن کی رسی دراز کیے جاتا ہے تاکہ جب انھیں پکڑا جائے تو ان کے پاس کوئی عذر اس کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہ جائے۔

٢٨۔ اصل میں لفظ 'اشتری' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی خریدنے کے ہیں۔ خریدنا چونکہ قیمت کے مقابل میں ایک لحاظ سے اس شے کو ترجیح دینا بھی ہے جسے آدمی کوئی قیمت ادا کر کے خریدتا ہے، اس وجہ سے یہ ترجیح دینے کے معنی اس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں جگہ جگہ آیا ہے۔

٢٩۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی منافقت کا پردہ چونکہ بالکل چاک کر دیا ہے، لہٰذا مصالحت کی اس پالیسی سے جو راہ انھوں نے پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے نتائج سے بچنے کے لیے نکالنا چاہی تھی، وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

جنتی آدمی

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۴)

وعن أبی هريرة، قال: قال أتی أعرابی النبی صلی الله عليه وسلم، فقال: دلنی علی عمل إذا عملته دخلت الجنة، قال: تعبد الله ولا تشرک به شيأ، وتقيم الصلاة المكتوبة، وتؤدی الزكاة المفروضة، وتصوم رمضان. قال والذی نفسی بيده لا أزيد علی هذا ولا أنقص منه. فلما ولی، قال النبی صلی الله عليه وسلم: من سره أن ينظر إلی رجل من اهل الجنة فلينظر إلی هذا.

اللغه

اعرابی: بدوی مراد ہے اعراب سے اسمِ نسبت ہے جس کے معنی بادیہ کے رہنے والے کے ہیں۔ اسی طرح شہر کے رہنے والوں کو عرب کہا جاتا ہے۔

تعبد الله: یہ خبر امر کے معنی میں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مصدر کے محل پر فعل استعمال کیا گیا ہے۔ گویا جملہ یہ ہے کہ 'هو عبادتک الله'۔ اس کی مثال قرآنِ مجید میں بھی ہے: 'ومن آياته يريكم

البرق' (الروم ۳۰: ۲۴)۔

ترجمہ

''حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کی: میری ایسے عمل کی طرف رہنمائی کیجیے کہ جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، فرض نماز قائم کرے، فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے کہا: اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، نہ میں اس پر کچھ اضافہ کروں گا اور نہ اس میں کمی۔ پھر جب وہ لوٹا تو آپ نے فرمایا: جسے کسی جنت والے کو دیکھنے سے مسرت ہوتی ہے اسے چاہیے کہ وہ اس شخص کو دیکھے۔''

متون

اس روایت کو بخاری، مسلم اور احمد بن حنبل نے تقریباً انھی الفاظ میں روایت کیا ہے۔ ''مرقاۃ'' میں ملا علی قاری نے کسی دوسرے متن کا حوالہ نہیں دیا۔ البتہ یہ توضیح ضرور موجود ہے کہ جس طرح اس روایت میں حج کا ذکر نہیں، اسی طرح ایک روایت میں روزے، ایک میں زکوٰۃ اور ایک میں ایمان کا ذکر نہیں ہے۔ مزید یہ کہ بعض میں صلۂ رحمی اور بعض میں خمس کی ادائیگی کا ذکر ہے۔

معنی

اس روایت میں دین کی بنیادی تعلیمات پر کماحقہٗ عمل کو یقینی نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوع کے ارشادات درحقیقت مخاطب کی رعایت سے ہیں۔ چنانچہ انھیں حتمی معنی میں لینا درست نہیں۔ اس طرح کے تمام ارشادات کو سورۂ عصر کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ جس میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کامیابی کے لیے اصل تقاضا کیا ہے۔

اعرابی کا آخری جملہ اس کی طرف سے تصدیق اور قبولیت میں شدت کا اظہار بھی ہے اور تردیدِ بدعت کا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اعلان بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اسی عزم کو دیکھ کر اسے جنتی قرار دیا ہے۔

قرآن سے تعلق

قرآنِ مجید میں یقینی نجات کا معیار سورۂ عصر میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ایمانیات، تمام اعمالِ صالحہ اور اپنے ماحول میں نیکی کی تلقین کو بنیادی شرائط کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات پر سیاق و سباق کے مطابق کہیں ایک چیز اور کہیں دوسری کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً 'فمن کان یرجوا لقاء ربه فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادة ربه احدا' میں 'تواصی' کا ذکر نہیں ہے۔ جس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی حیثیت بنیادی عنوانات کی ہے۔ روایات اور قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر انھی میں سے کسی چیز کو نمایاں کرنے کے لیے اس کا ذکر الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس سے اس چیز کی الگ اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

بخاری، کتاب الزکوٰۃ باب ۱۔ مسلم، کتاب الایمان باب ۴۔ مسندِ احمد عن ابوہریرہ۔

طالب محسن

استقامت

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۵)

وعن سفیان بن عبد اللّٰہ الثقفی، قال: قلت: یا رسول اللّٰہ، قل لی فی الاسلام قولا لا أسئل عنه أحدا بعدک، وفی روایة: غیرک. قال: قل، آمنت باللّٰہ ثم استقم.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اللغہ

فی الاسلام: اسلام کے بارے میں۔

الاستقامة: یہاں اس سے دین کے اوامر پر عمل اور نواہی سے گریز پر ثابت قدمی مراد ہے۔

ترجمہ

''حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتائیے کہ آپ کے بعد (اور ایک روایت میں آپ کے سوا) کسی سے نہ پوچھوں (یعنی پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔) آپ نے فرمایا: کہو میں ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔''

متون

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

قلت: یا رسول الله او صنی فقال: قل ربی الله ثم استقم قال، قلت ربی الله و ما توفیقی الا بالله علیه توکلت والیه انیب فقال لیهنک العلم ابا الحسن.

”میں نے رسول اللہ سے نصیحت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا: کہو اللہ میرا آقا ہے، پھر اس پر جم جاؤ۔ میں نے کہا: میرا آقا اللہ ہے۔ توفیق اللہ ہی دیتا ہے۔ میں اسی پر بھروسا کرتا ہوں۔ اسی کے آگے جھکتا ہوں۔ اس پر آپ نے کہا: ابو الحسن تمھیں یہ علم مبارک ہو۔“

لیکن الفاظ اور راوی ہی سے واضح ہے کہ مضمون میں کامل اشتراک کے باوجود یہ ایک الگ روایت ہے۔ البتہ ترمذی نے سفیان رضی اللہ عنہ کے ایک اور سوال کو بھی روایت کیا ہے:

قلت: یا رسول الله، ما اخوف ما اخاف علی. فاخذ بلسانه ثم قال هذا.

”میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول سب سے زیادہ ڈرنے والی چیز کون سی ہے کہ میں اس سے اندیشہ رکھوں۔ اس پر آپ نے اپنی زبان پکڑی اور کہا یہ ہے۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس اضافے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل گفتگو میں سوالات اور بھی کیے گئے ہوں گے۔ بہر حال موجود روایات میں سب سے مکمل روایت ترمذی ہی کی ہے۔

معنی

یہ روایت جوامع الکلم میں سے ہے اس میں دو ہی جملوں میں ساری بات سمیٹ دی گئی ہے۔ توحید کو ہمارے دین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح اسلام کو قبول کرنے کے بعد جو چیز مطلوب ہے وہ دین کے اوامر و نواہی پر عمل ہے۔ حقیقت کو قبول کرنے اور راہِ حق پر قدم رکھ دینے کے بعد جو چیز مراتب کے حصول کا ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایمانیات اور اعمالِ صالحہ پر استقامت ہے۔

قرآن سے تعلق

یہ روایت تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سراسر قرآنِ مجید سے ماخوذ ہے۔ سورۂ احقاف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا

”لاریب وہ لوگ جنھوں نے کہا: اللہ ہمارا رب

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (۱۳:۴۶)

ہے، پھر اس پر جم گئے تو ان کے لیے وہ ٹھکانا ہے جس میں نہ ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ ان کے لیے کوئی غم۔‘‘

اس آیۂ کریمہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کردار کی یہ خوبی کس شان دار انجام پر منتج ہو گی۔

کتابیات

مسلم، کتاب الایمان، باب ۱۳۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن باب ۱۲۔ ترمذی کتاب الزہد، باب ۵۱۔ مسندِ احمد، عن سفیان۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

عید کی نماز

(عید کی نسبت سے مشکوٰۃ المصابیح سے ایک انتخاب)

عن ابی سعید الخدری قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یخرج یوم الفطر والاضحی الی المصلی. فاول شیء یبدا به الصلاة. ثم ینصرف. فیقوم مقابل الناس. والناس جلوس علی صفوفهم. فیعظهم، ویوصیهم، ویامرهم. وان کان یریدان یقطع بعثا قطعه. اویامر بشیء امربه. ثم ینصوف.

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللغۃ

المصلی: نماز پڑھنے کی جگہ۔ یہاں اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز پڑھاتے تھے۔ یہ جگہ مدینے کے باہر تھی۔

فاول شیء یبدابه الصلاۃ: پہلی چیز جس سے آپ آغاز کرتے وہ نماز ہوتی۔ یہ جملہ اس پس منظر میں ہے کہ مدینہ کے اموی گورنر مروان بن حکم نے نماز سے پہلے خطبہ دینا چاہا تھا۔

بعثا: مصدر بمعنی مفعول۔ یہاں اس سے کوئی مہم وغیرہ بھیجنا مراد ہے۔

قطع: طے کر دیا یا نافذ کر دیا۔

ترجمہ

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے موقع پر عید گاہ کی طرف آتے۔ چنانچہ سب سے پہلے نماز پڑھاتے۔ اس کے بعد لوگوں کی طرف رخ پھیرتے اور ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ قطاروں میں بیٹھے رہتے۔ آپ انھیں دین بتاتے۔ انھیں تلقین کرتے اور انھیں ہدایات دیتے۔ اگر کوئی مہم بھیجنی ہوتی تو اس (کے معاملات) طے کر دیتے یا کوئی کام کرانا ہوتا تو اسے کرنے کے لیے کہہ دیتے۔ پھر (گھر کی طرف) واپس آجاتے۔''

متون

صاحبِ مشکوٰۃ کے اختیار کردہ اس متن کو بخاری نے ایک فرق کے ساتھ کتاب الجمعہ میں درج کیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ بخاری نے اس روایت کے آخر میں مروان بن حکم کے نماز سے پہلے خطبہ دینے کے واقعے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی سند سے بخاری نے کتاب الزکوٰۃ میں جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر خطباتِ عید میں خیرات کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اس مضمون کی روایات میں حضور کے اس خطاب کا بھی ذکر ہے جس میں آپ نے خواتین کو الگ سے نصیحتیں کیں اور انھیں ان کی مزاجی اور طبعی کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی۔

یہ بات طے کرنا مشکل ہے کہ یہ تمام روایات ایک ہی عید سے متعلق ہیں یا ان کا تعلق مختلف مواقع سے ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے جب گورنر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے انحراف کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے بات حضور کے عید سے متعلق معمول سے شروع کی اور پھر ان کی توجہ حضور کے ایک خاص خطبے کی طرف چلی گئی اور انھوں نے اس کی تفصیلات بیان کرنی شروع کر دیں۔

معنی

یہ روایت بنیادی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عید کی نماز پڑھانے کا طریقہ بیان کرتی ہے۔ جو آپ نماز عید پڑھانے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ امت اسی طریقے پر عمل پیرا ہے اور اس کے اس عمل کی بنیاد کسی روایت پر نہیں بلکہ صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر پر ہے۔ حضور عید کے دن نماز و خطبے کے لیے مسجدِ نبوی کے بجائے کھلے میدان میں جاتے تھے۔ پہلے نماز پڑھاتے، پھر خطبہ دیتے اور بعد ازاں اگر ضروری

ہوتا تو دوسرے امور انجام دیتے۔

قرآن سے تعلق

شریعت کے متعدد امور کا اصل ماخذ سنت ہے۔ عیدین کی نماز اور خطبہ بھی انھی امور میں سے ایک ہے۔ اگرچہ سنت پر مبنی بعض امور کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن عیدین کے معاملے میں قرآنِ مجید میں کوئی بات بھی بیان نہیں ہوئی۔ اس مثال سے ان لوگوں کے نقطۂ نظر کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو سارے کے سارے دین کو قرآنِ مجید ہی سے برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

کتابیات

بخاری، کتاب الحیض، باب ۶، کتاب الجمعہ، باب ۱۵، کتاب الزکوٰۃ، باب ۴۴، کتاب الصوم، باب ۴۰، کتاب الشہادات، باب ۱۲۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۴، کتاب صلاۃ العیدین، باب ۱۔ نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب ۲۰، باب ۲۳۔ ابنِ ماجہ کتاب الاقامۃ، باب ۱۵۸ اور مسندِ احمد، عن ابی سعید الخدری۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

عید کی خوشی

عن عائشة قالت: ان ابابکر دخل علیها. وعندها جاریتان فی ایام منی تدفقان وتضربان. وفی روایة: تغنیان بما تقاولت الانصار یوم بعاث. والنبی متغش بثوبه. فانتهر هما ابوبکر. فکشف النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم عن وجهه. فقال: دعهما یا ابابکر، فانها ایام عید. وفی روایة: یا ابابکر ان لکل قوم عیدا. وهذا عیدنا.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اللغہ

ابابکر: بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ واقعہ سناتے ہوئے اپنے والد کا نام اس طرح نہیں لیا ہوگا۔ اور یہ بعد میں کسی راوی نے تصرف کیا ہے۔

جاریتان: دو چھوٹی بچیاں۔

تدفقان: دف بجانا۔

تضربان: اس کا مطلب اگرچہ مارنا ہے لیکن یہاں یہ دف بجانے ہی کے معنی میں ہے۔ دف بجاتے ہوئے مختلف آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ غالباً 'تدفیق' اور 'ضرب' کے الفاظ اسی پہلو کو بیان کرنے کے لیے یکجا استعمال

کیے گئے ہیں۔

تقاولت: ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا۔

بعاث: مدینے سے باہر ایک مقام جہاں قبیلہ اوس کا قلعہ تھا۔ اس مقام پر اوس و خزرج کے مابین ایک خوف ناک جنگ ہوئی جس میں بڑی تعداد میں فریقین کے مرد کام آئے۔

متغش: ڈھنپا ہوا۔

انتھر: ڈانٹا۔

ترجمہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے ہاں تشریف لائے۔ قربانی کے دن تھے اور ان کے پاس دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ بعاث کی جنگ میں گائی گئی کوئی نظم بھی گا رہی تھیں۔ (پاس ہی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر لے کر (لیٹے ہوئے تھے)۔ حضرت ابو بکر نے ان دونوں کو ڈانٹا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے (چادر) ہٹائی اور فرمایا: ابو بکر، انھیں نہ روکو، کیونکہ یہ عید کے دن ہیں۔ ایک روایت میں آپ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں ہے: ابو بکر ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔

متون

اس روایت میں عام طور پر یہی بات بیان کی گئی ہے کہ یہ واقعہ عید الاضحیٰ کے موقع پر پیش آیا۔ لیکن بخاری نے کتاب المناقب میں جن روایات کو لیا ہے ان میں سے ایک روایت میں اس معاملے میں شبہے کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کسی عیدِ قربان ہی کے موقع پر پیش آیا۔ بعض روایات میں اسی موقع پر حبشیوں کے کرتب دکھانے کے واقعے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے اس گانے بجانے پر 'مزمار الشیطان' کا تبصرہ بھی کیا تھا۔

ان اہم اختلافات کے علاوہ اس روایت میں لفظی فرق بھی ہیں، مثلاً ایک روایت میں 'جاریتان' کے بجائے 'قینتان' کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعض روایات میں 'متغش' کی جگہ 'مسجی' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

معنی

اس واقعے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تفریح سے متعلق رویہ سامنے آتا ہے۔ مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد لوگوں میں عام طور پر ہنسی کھیل سے گریز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس گریز کی اپنی جگہ پر ایک اہمیت ہے۔ لیکن اس کی حد کیا ہے؟ اس روایت میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔ عید اور شادی بیاہ کے موقع پر ہر قوم میں خوشی منانے کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے جو اس روایت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے بعض علما موسیقی کو مطلقاً حرام سمجھتے ہیں۔ اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکیزہ ماحول اور پاکیزہ مضامین کی صورت میں موسیقی جائز ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ کی یہی صورت ہے۔ یہ اصلاً مباح ہیں بشرطیکہ دین واخلاق کی حدود پامال نہ کی جائیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گانے بجانے کو 'مزمار الشیطان' قرار دیا ہے۔ انھوں نے یہ بات یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا کردہ ماحول ہی کے باعث کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے انھیں ڈانٹنے سے روک کر یہ واضح کر دیا کہ میری اس نوع کی باتوں کا اس گانے بجانے سے تعلق نہیں ہے۔

قرآن سے تعلق

قرآنِ مجید میں تفریح سے بالکلیہ منع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح گانے بجانے سے بھی گانے بجانے کا ذکر کر کے نہیں روکا گیا۔ بعض علما سورۂ جمعہ میں 'لھو' کے بارے میں وارد ناپسندیدگی سے استدلال کرتے ہیں۔ 'لھو' کا لفظ کھیل کود اور بے کار مشغلے کے معنی میں آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تفریح کی بہت سی صورتیں اس لفظ کے تحت آتی ہیں۔ لیکن سورۂ جمعہ میں یہ ناپسندیدگی کا اظہار مطلق نہیں ہے۔ اس ناپسندیدگی کا تعلق ان مواقع سے ہے جب دین کے تقاضے پر تفریح غلبہ پالے۔ ظاہر ہے اس صورت میں تفریح کی طرف رغبت کو ناپسندیدہ ہی قرار دیا جائے گا۔

کتابیات

بخاری، کتاب الجمعہ، باب ۴۷، ۴۸، ۷۰، کتاب الجہاد، باب ۸۰، کتاب المناقب، باب ۱۳، ۱۰۰۔ مسلم، کتاب صلاۃ العیدین، باب ۵۔ نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب ۳۳، ۳۴، ۳۵۔ ابنِ ماجہ، کتاب النکاح، باب ۲۱۔ مسندِ احمد، عن عائشہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

میزان

جاوید احمد غامدی

اسلام اور تصوف

ہمارے خانقاہی نظام کی بنیاد جس دین پر رکھی گئی ہے، اُس کے لیے ہمارے ہاں 'تصوف' کی اصطلاح رائج ہے۔ یہ اُس دین کے اصول و مبادی سے بالکل مختلف ایک متوازی دین ہے جس کی دعوت قرآن مجید نے بنی آدم کو دی ہے۔ اسلام اور تصوف کے بارے میں اپنا یہ نقطۂ نظر ہم ذیل میں تفصیل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

توحید

قرآن کی رو سے توحید بس یہ ہے کہ الٰہ صرف اللہ کو مانا جائے جو اُن تمام صفات کمال سے متصف اور عیوب و نقائص سے منزہ ہے جنھیں عقل مانتی اور جن کی وضاحت خود اللہ پروردگار عالم نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے کی ہے۔ 'الٰہ' کا لفظ عربی زبان میں اُس ہستی کے لیے بولا جاتا ہے جس کے لیے کسی نہ کسی درجے میں اسباب و علل سے ماورا امر و تصرف ثابت کیا جائے۔ قرآن مجید کے نزدیک کوئی ایسی صفت یا حق بھی اگر کسی کے لیے تسلیم کیا جائے جو اِس امر و تصرف ہی کی بنا پر حاصل ہو سکتا ہو تو یہ در حقیقت اُسے 'الٰہ' بنانا ہے۔ چنانچہ وہ اِس امر و تصرف اور اِن حقوق و صفات کو صرف اللہ کے لیے ثابت قرار دیتا ہے۔ بنی آدم سے اُس کا مطالبہ ہے کہ وہ بھی اپنے ایمان و عمل اور طلب و ارادہ میں اِسے اللہ ہی کے لیے ثابت قرار دیں۔ 'شرک' اُس کی اصطلاح میں اِسی سے انحراف کی تعبیر ہے۔

یہی توحید ہے جس پر اللہ کا دین قائم ہوا۔ یہی اُس دین کی ابتدا، یہی انتہا اور یہی باطن و ظاہر ہے۔ اِسی کی

دعوت اللہ کے نبیوں نے دی۔ ابراہیم و موسیٰ، یوحنا و مسیح اور نبی عربی ـــــ اِن پر اللہ کی رحمتیں ہوں ـــــ سب اِسی کی منادی کرتے ہیں۔ تمام الہامی کتابیں اِسے ہی لے کر نازل ہوئیں۔ اِس سے اوپر توحید کا کوئی درجہ نہیں ہے، جسے انسان اِس دنیا میں حاصل کرنے کی سعی کرے۔ قرآن مجید نے شروع سے آخر تک اِسے ہی بیان کیا ہے۔ سورۂ حشر میں ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَکَبِّرُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ. هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ. (۵۹: ۲۲-۲۴)

”وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، غائب و حاضر سے باخبر۔ وہ سراسر رحمت ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پادشاہ، وہ منزہ ہستی، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بڑے زور والا، بڑائی کا مالک۔ پاک ہے اللہ اُن سے جو یہ شریک بتاتے ہیں۔ وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت دینے والا۔ سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔ اُسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔“

سورۂ اخلاص میں یہ اِس طرح بیان ہوئی ہے:

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمۡ یَلِدۡ ۙ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ. وَلَمۡ یَکُنۡ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ. (۱۱۲: ۱-۴)

”کہہ دو، اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب کا سہارا ہے۔ وہ نہ باپ ہے، نہ بیٹا اور نہ اُس کا کوئی ہم سر ہے۔“

توبہ میں ہے:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ. (۹: ۳۱)

”اُنھوں نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ اُنھیں بس یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پاک

ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔‘‘

اہل تصوف کے دین میں یہ توحید کا پہلا درجہ ہے۔ وہ اِسے عامۃ الناس کی توحید قرار دیتے ہیں۔ توحید کے مضمون میں اِس کی اہمیت، اُن کے نزدیک، تمہید سے زیادہ نہیں ہے۔ توحید کا سب سے اونچا درجہ اُن کے نزدیک یہ ہے کہ موجود صرف اللہ کو مانا جائے، جس کے علاوہ کوئی دوسری ہستی در حقیقت موجود نہیں ہے۔ تمام تعینات عالم، خواہ وہ محسوس ہوں یا معقول، وجود حق سے منتزع اور محض اعتبارات ہیں، اُن کے لیے خارج میں وجود حق کے سوا اور کوئی وجود نہیں ہے۔ ذات باری ہی کے مظاہر کا دوسرا نام عالم ہے۔ یہ باعتبار وجود خدا ہی ہے، اگرچہ اِسے تعینات کے اعتبار سے خدا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس کی ماہیت عدم ہے۔ اِس کے لیے اگر وجود ثابت کیا جائے تو یہ شرک فی الوجود ہو گا۔ 'لا موجود إلا اللّٰہ' سے اِسی کی نفی کی جاتی ہے:

جاروب 'لا' بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگرد فرش و سینہ بایواں برابرست

صاحب ’’منازل‘‘[1] لکھتے ہیں:

التوحید علی ثلاثۃ أوجہ: الوجہ الأوّل: توحید العامۃ وھو الذي یصح بالشواھد، والوجہ الثاني: توحید الخاصۃ وھو الذي یثبت بالحقائق، والوجہ الثالث: توحید قائم بالقدم وھو توحید

’’توحید کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ عوام کی توحید کا ہے، یہ وہ توحید ہے جس کی صحت دلائل[2] پر مبنی ہے۔ دوسرا درجہ خواص کی توحید کا ہے، یہ حقائق[3] سے ثابت ہوتی ہے۔ توحید کا تیسرا درجہ وہ ہے جس میں وہ ذات قدیم ہی کے ساتھ قائم ہے،[4]

۱۔ ’’منازل السائرین‘‘، علم تصوف کا اہم ترین ماخذ۔ شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل عبد اللہ بن محمد بن علی الانصاری الہروی کی تصنیف ہے۔ خراساں کے شیخ اور اپنے زمانے کے اکابر حنابلہ میں سے تھے۔ ۴۸۱ھ میں وفات پائی۔

۲۔ یعنی وہ دلائل جو عقل و فطرت اور وحی الٰہی کی شہادت سے ثابت ہیں۔

۳۔ یعنی مکاشفہ و مشاہدہ وغیرہ، وہ حقائق جن کا ذکر اُنھوں نے اِسی عنوان کے تحت ’’منازل السائرین‘‘ میں کیا ہے۔

۴۔ یعنی اِس مرتبہ میں بندے کے لیے وجود چونکہ ثابت نہیں رہتا، اِس لیے وہ جس کی توحید بیان کی جاتی ہے، وہی در حقیقت اپنی توحید بیان کرتا ہے۔ چنانچہ توحید صرف ذات باری ہی کے ساتھ قائم قرار پاتی ہے، ذات باری کے سوا کسی موحد کا اثبات اِس مرتبہ میں اُن کے نزدیک الحاد کے مترادف ہے۔ صاحب ’’منازل‘‘ کہتے ہیں:

خاصة الخاصة. فأما التوحيد الأول فهو شهادة أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، الأحد الصمد الذي لم يلد ولم يولد، ولم يكن له كفوًا أحد.(۴۷)

یہ اخص الخواص کی توحید ہے۔ اب جہاں تک عوام کی توحید کا تعلق ہے تو وہ بس یہ ہے کہ اِس بات کی گواہی دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، صرف وہی الٰہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ یکتا ہے، سب کا سہارا ہے، وہ نہ باپ ہے، نہ بیٹا اور نہ اُس کا کوئی ہم سر ہے۔"

اپنی اِس توحید کی وضاحت میں، جسے اُنھوں نے 'قائم بالقدم' کے الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

إنه إسقاط الحدث وإثبات القدم. (۴۷)

"یہ حادث کی نفی اور قدیم کا اثبات ہے۔"[5]

یہی بات غزالی[6] نے لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

والرابعة: أن لا يرى في الوجود إلا واحدًا وهي مشاهدة الصديقين و تسميه الصوفية الفناء في التوحيد، لأنه من حيث لا يرى إلا واحدًا فلا يرى نفسه أيضًا وإذا لم ير نفسه لكونه مستغرقًا بالتوحيد، كان فانيًا عن نفسه في توحيده بمعنى أنه فنى عن رؤية نفسه والخلق.

"توحید کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ بندہ صرف ذات باری ہی کو موجود دیکھے۔ یہی صدیقین کا مشاہدہ ہے اور صوفیہ اِسے ہی فنا فی التوحید کہتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس مرتبہ میں بندہ چونکہ وجود واحد کے سوا کچھ نہیں دیکھتا، چنانچہ وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا۔ اور جب وہ توحید میں اس استغراق کے باعث اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا تو اُس کی ذات اِس توحید میں فنا ہو جاتی ہے،

توحيده إياه توحيده ونعت من ينعته لاحد

"اُس کی توحید در حقیقت اُس کا آپ ہی اپنی توحید بیان کرنا ہے، دوسرا اگر اُس کی توحید بیان کرے تو یہ الحاد ہے۔"

۵۔ یعنی اِس بات کا اقرار کہ موجود صرف اللہ ہی ہے۔

۶۔ ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، حجۃ الاسلام کے لقب سے معروف ہیں۔ طوس کے قصبہ طابران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ "احیاء علوم الدین" علوم تصوف میں اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ ۵۰۵ھ میں وفات پائی۔

(احیاءعلوم الدین ۲۴۵/۴) یعنی اِس مرتبہ ہیں اُس کا نفس اور مخلوق، دونوں اُس کی نگاہوں کے لیے معدوم ہو جاتے ہیں۔"

ابن عربی نے اپنی کتابوں، بالخصوص "فصوص" اور "فتوحات"[7] میں اِسی عقیدہ کی شرح و وضاحت کی ہے۔ اُن کے نزدیک عارف وہی ہے جو ذات حق اور ذات عالم کو باعتبار حقیقت الگ الگ نہ سمجھے، بلکہ جس کو، جس سے، جس میں اور جس کے ذریعے سے دیکھے، سب کو اِس اعتبار سے ذات حق ہی قرار دے۔[8]

فص ہودیہ میں ہے:

فمن رأى الحق منه فيه بعينه فذلك العارف، ومن رأى الحق منه فيه بعين نفسه فذلك غير العارف، ومن لم ير الحق منه ولا فيه وانتظر أن يراه بعين نفسه فهو الجاهل المحجوب. (فصوص الحکم ۱۱۳)

"پس جس نے حق کو، حق سے، حق میں، چشم حق سے دیکھا، وہی عارف ہے۔ اور جس نے حق کو حق سے، حق میں دیکھا، مگر بچشم خود دیکھا، وہ عارف نہیں ہے۔ اور جس نے حق کو نہ حق سے دیکھا اور نہ حق میں اور اِس انتظار میں رہا کہ وہ اِسے بچشم خود ہی دیکھے گا[9] تو وہ مشاہدۂ حق سے محروم محض جاہل ہے۔"

وہ لکھتے ہیں:

فلم يبق إلا الحق لم يبق كائن   فما ثم موصول و ما ثم بائن[10]

"وجود ایک ہی حقیقت ہے، اِس لیے ذات باری کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ نہ کوئی ملا ہوا ہے، نہ کوئی جدا ہے، یہاں ایک ہی ذات ہے جو عین وجود ہے۔"

فص ادریسیہ میں ہے:

۷۔ "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" شیخ محی الدین ابن عربی کی اہم ترین تصنیفات ہیں۔ اہل تصوف اُنھیں شیخ اکبر کہتے ہیں۔ ۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۳۸ھ میں دمشق میں وفات پائی۔

۸۔ یعنی اِس بات کا اقرار کرے کہ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔

۹۔ یعنی اس نقطۂ نظر پر قائم رہا کہ خالق اور مخلوق میں باعتبار حقیقت مغایرت ہے۔

۱۰۔ فصوص الحکم، فص اسماعیلیہ ۹۳۔

فالأمر الخالق المخلوق، والأمر المخلوق الخالق، کل ذلک من عین واحدۃ، لا بل ھو العین الواحدۃ، وھو العیون الکثیرۃ.(فصوص الحکم ۷۸)

''اگرچہ مخلوق، بظاہر خالق سے الگ ہے، لیکن باعتبار حقیقت خالق ہی مخلوق اور مخلوق ہی خالق ہے۔ یہ سب ایک ہی حقیقت سے ہیں۔ نہیں، بلکہ وہی حقیقت واحدہ اور وہی اِن سب حقائق میں نمایاں ہے۔''[11]

شیخ احمد سرہندی[12] نے صرف ممکنات کی ماہیت میں ابن عربی سے اختلاف کیا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک وہ اسما و صفات ہیں جنھیں مرتبۂ علم میں امتیاز حاصل ہوا ہے اور شیخ اُنھیں عدمات قرار دیتے ہیں جنھوں نے علم خداوندی میں تعین پیدا کیا اور مرتبۂ وہم و حس میں ثابت ہو گئے ہیں۔ رہا اُن کے وجود کا مسئلہ تو اِس کے بارے میں اُن کی رائے بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

ممکن را وجود ثابت کردن و خیر و کمال باو داشتن فی الحقیقت شریک کردن است اورا در ملک و ملک حق جل سلطانہ.(مکتوبات ۲، مکتوب ۱)

''ممکن کے لیے وجود ثابت کرنا اور خیر و کمال کو اُس سے متعلق ٹھیرانا در حقیقت اُسے ذات باری کی مِلک اور مُلک میں شریک کرنا ہے۔''

تاہم، اپنے اِسی اختلاف کی بنا پر اُنھوں نے توحید شہودی کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عالم چونکہ مرتبۂ وہم میں بہر حال ثابت ہے، اِس لیے نفی صرف شہود کی ہونی چاہیے۔ اُن کے نزدیک، اِس مقام پر سالک اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اِس وقت اُس کی توحید یہ ہے کہ وہ مشہود صرف اللہ کو مانے۔ ''مکتوبات'' میں ہے:

توحید شہودی یکے دیدن است، یعنی مشہود سالک جز یکے نہ باشد.(مکتوبات ۱، مکتوب ۴۳)

''توحید شہودی یہ ہے کہ تنہا ذات حق ہی دکھائی دے، یعنی سالک کا مشہود اُس ذات کے سوا کوئی

۱۱۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کے بیٹے کو ایک بڑی قربانی کے عوض میں چھڑا لیا۔ پس مینڈھے کی صورت میں وہی تو ظاہر ہوا جو انسان، یعنی ابراہیم کی صورت میں اور جو ابراہیم کے بیٹے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ نہیں، بلکہ بیٹے کے حکم کے ساتھ وہی ظاہر ہوا جو والد کا عین تھا، یعنی اللہ تعالیٰ۔''(فص ادریسیہ ۷۸)

۱۲۔ شیخ احمد بدر الدین ابو البرکات فاروقی سرہندی، شیخ مجدد اور مجدد الف ثانی کے لقب سے معروف ہیں۔ ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے افکار کے بہترین ترجمان اُن کے ''مکتوبات'' ہیں۔ ۱۰۳۴ھ میں اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔

دوسرا نہ ہو۔''

یہ محض تعبیر کا فرق ہے۔اِس باب میں قرآن مجید کی اُس صراط مستقیم سے انحراف کے بعد، جس میں نہ ممکن کے لیے وجود کا اثبات کوئی شرک ہے اور نہ موجود یا مشہود صرف اللہ ہی کو قرار دینا توحید کا کوئی مرتبہ ہے، اہل تصوف نے جو راہ اختیار کی ہے، یہ سب اُسی کے احوال و مقامات ہیں۔

شاہ اسمٰعیل اِس حقیقت کی وضاحت میں کہ یہ فی الواقع محض تعبیر کا فرق ہے، اپنی کتاب ''عبقات''[۱۳] میں لکھتے ہیں:

اتفق أهل الكشف والوجدان وأرباب الشهود والعرفان مويدين بالبراهين العقلية والإشارات النقلية على أن القيوم للكثرات الكونية واحد شخصي. (اشارہ ۱، عبقہ ۲۰)

''وہ سب لوگ جو کشف و وجدان اور شہود و عرفان کی نعمت سے بہرہ یاب ہوئے،[۱۴] اِس بات پر متفق ہیں کہ تمام مخلوقات کے لیے مابہ التعین[۱۵] ایک ہی متعین وجود ہے[۱۶] اور عقل کے دلائل اور قرآن و حدیث کے اشارات سے اُن کی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وہ فرماتے ہیں:

وليس بينهم وبين الشهودية الظلية

''اور اُن میں (وجودیہ ورائیہ میں)[۱۷] اور شہودیہ

۱۳۔ ''عبقات''، علم تصوف کا بے مثال شہ پارہ۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل کی تصنیف ہے۔ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ سید احمد بریلوی کی قیادت میں دعوت و جہاد کی عظیم تحریک برپا کی۔ ۱۲۴۶ھ میں بالا کوٹ کے مقام پر سکھوں کے خلاف ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔

۱۴۔ یعنی ارباب تصوف۔

۱۵۔ یعنی جس سے کوئی چیز موجود ہوتی ہے، جیسے لوہے سے تلوار اور چھری وغیرہ۔

۱۶۔ یعنی ذات باری مرتبۂ 'وجود منبسط' میں۔ یہ ذات باری کا وہی مرتبہ ہے جسے ابن عربی 'ظاہر الوجود' کہتے ہیں۔ اِس مرتبہ میں اُن کے نزدیک، ذات باری کے لیے عالم کے ساتھ وہ نسبت وجود میں آتی ہے جو، مثلاً لوہے کو اُس تلوار کے ساتھ ہے جو اُس سے بنائی جاتی ہے۔ یہ مراتب اسمامیں سے پانچواں مرتبہ ہے۔

۱۷۔ یعنی توحید وجودی کے ماننے والے۔

اختلاف عند التحقيق، إلا في العبارات الناشئة من تغاير مقاماتهم واختلاف انحاء وصولهم إلى اللاهوت.

(اشارہ ا، عبقہ ۲۰)

ظلیہ[18] میں، اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو اِس کے سوا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنے مقامات کے فرق اور لاہوت[19] تک پہنچنے کی راہوں کے اختلاف کی وجہ سے اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے ایک دوسرے سے ذرا مختلف اسلوب اختیار کیا ہے۔"

چنانچہ خود صاحب "عبقات" نے اپنی اِس توحید کے مراتب اِس طرح بیان کیے ہیں:

التفطن بالوحدة القيومية للكثرة الكونية واستقلالها بالتحقيق والمبدئية للاثار واضمحلال الكثرة تحتها وتبعيتها في الوجود يقينًا واطمئنانًا علمًا أو عينًا أو حقًا يسمى بتوحيد ظاهر الوجود.(اشارہ ا، عبقہ ۱۴)

"یہ بات، اگر فی الواقع سمجھ میں آ جائے، خواہ یہ علم الیقین کے درجے میں ہو یا عین الیقین کے درجے میں اور خواہ حق الیقین کے درجے میں کہ تمام مخلوقات کے لیے مابہ التعین ایک ہی ہے؛ استقلال، در حقیقت اُسے ہی حاصل ہے؛ آثار کا مبدا وہی ہے؛ کثرت اُس کے سامنے کچھ نہیں اور باعتبار وجود اُس کے تابع ہے، تو اِسے 'توحید ظاہر الوجود' کہا جاتا ہے۔"

اِسی "اشارہ" میں ہے:

فلا يزال العارف يسير في الله حتى ينكشف الوحدة الجامعة لشتات الأسماء

"چنانچہ عارف کی یہ 'سیر فی اللّٰہ'[20] جاری رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اُس وحدت کو

۱۸۔ یعنی توحید شہودی کے ماننے والے۔

۱۹۔ 'لاہوت' کا لفظ اہل تصوف کے ہاں ذات باری ہی کے لیے مستعمل ہے۔ صاحب "عبقات" لکھتے ہیں: 'قد جرت عادتهم بأن يسموا ذات الفاطر باللاهوت' (اشارہ ا، عبقہ ۱۷)۔

۲۰۔ 'سیر فی اللّٰہ' سالک کے لیے ذات باری کے اُس مرتبے کا انکشاف ہے جس کے لیے اُن کے ہاں 'باطن الوجود' کی اصطلاح مستعمل ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وهذا يسمى بتوحيد باطن الوجود. (اشارہ ۱۵، عبقہ ۳۶)

پلٹتا ہے جو تمام اسما کے لیے وحدت جامعہ ہے۔ یہ 'توحید باطن الوجود'[21] ہے۔''

پھر یہی نہیں، قرآن جس توحید کی دعوت بنی آدم کو دیتا ہے، وہ اُس کے نزدیک ایک واضح حقیقت ہے، جسے خود عالم کے پروردگار نے اپنی کتابوں میں بیان کیا، جس کی تعریف اُس کے نبیوں نے کی، جسے دلوں نے سمجھا، جس کا اقرار زبانوں نے کیا، جس کی گواہی اُس کے فرشتوں اور سب اہل علم نے دی اور جس کا کوئی پہلو اب سننے والوں اور جاننے والوں سے پردۂ خفا میں نہیں ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (آل عمران ۳:۱۸)

''اللہ، اُس کے فرشتوں اور اہل علم نے گواہی دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ عدل کا قائم رکھنے والا ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ سب پر غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔''

اللہ کے سب نبی اِسے دنیا میں عام کرنے اور انسانوں کو اِس کی طرف بلانے کے لیے آئے۔ اُنھیں اُس ہستی نے جس کا ارشاد ہے کہ وہ کسی کو تکلیف مالایطاق نہیں دیتی، اِس کا مکلف ٹھیرایا کہ وہ اِس کی تبلیغ کریں۔ اُنھیں بتایا گیا کہ اِس میں اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ عین اُس فرض رسالت کے ادا کرنے میں کوتاہی ہو گی، جس کے ادا کرنے ہی کے لیے اللہ نے اُنھیں اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (المائدہ ۵:۶۷)

''اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتارا گیا ہے، اُسے اچھی طرح پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھا جائے گا کہ) تم نے اُس کا کچھ پیغام نہیں پہنچایا۔''

اہل تصوف کے دین میں جب سالک اِس توحید کے اسرار پر مطلع ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوئی تو الفاظ اُس کی تعبیر سے قاصر اور زبان اُس کی تعریف اور اُس کی تبلیغ سے عاجز ہو جاتی ہے۔[22] ''منازل'' میں ہے:

۲۱۔ اُن کی اصطلاح میں ذات باری کے مراتب اسما میں سے تیسرا مرتبہ جسے یہ واحدیت، تنزل علمی اور عالم عقلی بھی کہتے ہیں۔

۲۲۔ تاہم، یہ اسرار اگر کبھی زبان پر آتے ہیں تو خانقاہوں کی فضا 'أنا الحق' (میں حق ہوں)، 'سبحاني ما أعظم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فإن ذٰلک التوحید تزیده العبارة خفاء والصفة نفورًا والبسط صعوبة.(۴۸)

''چنانچہ اِس توحید کو ظاہر کیجیے تو اور چھپتی ہے، اِس کی وضاحت کیجیے تو اور دور ہوتی ہے اور اِس کو کھولیے تو اور الجھتی ہے۔''

وہ فرماتے ہیں:

وألاح منه لائحًا إلی أسرار طائفة من صفوته وأخرسهم عن نعته وأعجزهم عن بثه.(۴۷)

''اور یہ توحید ذات باری کی طرف سے اُس کے منتخب بندوں کی ایک جماعت ہی کے اسرار میں کچھ ظاہر ہوئی اور اِس نے اُنھیں اُس کے بیان سے قاصر اور اُس کے پھیلانے سے عاجز کر دیا۔''

غزالی نے لکھا ہے:

فاعلم أن هذه غایة علوم المکاشفات وأسرار هذا العلم لا یجوز أن تسطر في کتاب، فقد قالالعارفون: إفشاء سر الربوبیة کفر.(احیاءعلوم الدین ۴/۲۴۶)

''پس جاننا چاہیے کہ علوم مکاشفات کی اصل غایت یہی توحید ہے اور اِس علم کے اسرار کسی کتاب میں لکھے نہیں جا سکتے، اِس لیے کہ حدیث عارفاں ہے کہ سر ربوبیت کو فاش کرنا کفر ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

توحید کے باب میں یہی نقطۂ نظر اپنشدوں کے شارح شری شنکر اچاریہ، شری رام نوج اچاریہ، حکیم فلوطین اور اسپنوزا کا ہے۔ مغرب کے حکما میں سے لائبنز، فختے، ہیگل، شوپن ہاور اور بریڈلے بھی اِسی سے متاثر ہیں۔ اِن میں سے شری شنکر، فلوطین اور اسپنوزا وجودی اور رام نوج اچاریہ شہودی ہیں۔ گیتا میں شری کرشن نے بھی یہی تعلیم دی ہے۔ اپنشد، برہم سوتر، گیتا اور فصوص الحکم کو اِس دین میں وہی حیثیت حاصل ہے جو نبیوں کے دین میں تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو حاصل ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کی ہدایت، یعنی اسلام کے مقابلے میں تصوف وہ عالم گیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متاثر کیا ہے۔

نبوت و رسالت

قرآن کی رو سے نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب نہ کسی کے لیے

شأني'!(میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے)! اور ' ما في جبتي إلا اللّٰه'(میرے جبے میں اللہ کے سوا کوئی نہیں) کی صداؤں سے معمور ہو جاتی ہے۔

وحی و الہام اور مشاہدۂ غیب کا کوئی امکان ہے اور نہ اِس بنا پر کوئی عصمت و حفاظت اب کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ختم نبوت کے یہ معنی خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالصراحت بیان فرمائے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

لم يبق من النبوة إلا المبشرات. قالوا: وما المبشرات؟ قال: الرؤيا الصالحة. (بخاری، رقم ۶۹۹۰)

''نبوت میں سے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا: یہ مبشرات کیا ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا خواب۔''[۲۳]

اہل تصوف کے دین میں یہ سب چیزیں اب بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ اُن کے نزدیک وحی اب بھی آتی ہے، فرشتے اب بھی اترتے ہیں، عالم غیب کا مشاہدہ اب بھی ہوتا ہے اور اُن کے اکابر اللہ کی ہدایت اب بھی وہیں سے پاتے ہیں جہاں سے جبریل امین اُسے پاتے اور جہاں سے یہ کبھی اللہ کے نبیوں نے پائی تھی۔ غزالی کہتے ہیں:

من أول الطريقة تبتدئ المكاشفات والمشاهدات حتى أنهم في يقظتهم يشاهدون الملٰئكة وأرواح الأنبياء ويسمعون منهم أصواتًا ويقتبسون منهم فوائد. (المنقذ من الضلال ۵۰)

''اِس راہ کے مسافروں کو مکاشفات و مشاہدات کی نعمت ابتدا ہی میں حاصل ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بیداری کی حالت میں نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ کرتے، اُن کی آوازیں سنتے اور اُن سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اِن اکابر کا الہام اِن کی عصمت کی وجہ سے قرآن مجید ہی کی طرح شائبۂ باطل سے پاک اور ہر شبہ سے بالا ہوتا ہے۔ صاحب ''عبقات'' اُس ہستی کے بارے میں جو اُن کے نزدیک مقامات وہبیہ میں پہلے مقام[۲۴] پر فائز ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

فهو وجيه معصوم صاحب ذوق

''چنانچہ یہ ہستی صاحب وجاہت، معصوم،

۲۳۔ اِس مضمون کی روایات مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، موطا، مسند احمد بن حنبل اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہیں۔

۲۴۔ یہ اُن کے نزدیک سابقین کے مقامات میں سے تیسرا مقام ہے۔ قدما اِسے 'صدیقیت' کہتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی کی اصطلاح میں یہ 'ولایت علیا' ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اِسے 'قرب وجود' اور 'حکمت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِس سے آگے 'مقام تحدیث' ہے۔ اِس کا حامل اور نبی، اُن کے نزدیک ایک ہی نوع کی دو صنفیں ہیں، اُن میں باہم وہی فرق ہے جو مثال کے طور پر یوحنا و مسیح اور محمد عربی میں ہے۔ (اشارہ ۴، عبقہ ۱۱-۱۲)

حكيم، ثم إن مما يقتضي تربية الله إياه أن يلقي عليه علومًا نافعة في قيامه بمنصبه فهذا الإلقاء يسمّٰى تفهيمًا. وإن مما يقتضي تيقظ روحه وعصمته إلا يختلط بعلومه شيء مغاير لما تلقاه من الغيب. ولذٰلك كانت الحكمة كلها حقًا لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه. ولما كان التفهيم من أعلٰى أقسامها فلا بعد أن يسمى بالوحي الباطن.
(اشارہ ۴، عبقہ ۱۱)

صاحب ذوق اور صاحب حکمت ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اِس کی تربیت کے پیش نظر اِس پر وہ علوم القا فرماتے ہیں جو اِس کے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اِس کے لیے نافع ہوتے ہیں۔ اِس القا کو تفہیم بھی کہتے ہیں۔ پھر اِس کی عصمت اور اِس کی روح کی بیداری کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ اِس نے جو کچھ غیب سے پایا ہے، اُس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کی حکمت تمام تر حق ہوتی ہے، جس میں باطل نہ آگے سے کوئی راہ پا سکتا ہے، نہ پیچھے سے۔ اور یہ تفہیم چونکہ اِس حکمت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے، اِس وجہ سے اِسے اگر 'وحی باطن' سے تعبیر کیا جائے تو یہ کوئی بعید تعبیر نہ ہو گی۔''

اُن کے نزدیک یہ ہستی اگر نبی کی مقلد بھی بظاہر نظر آتی ہے تو صرف اِس وجہ سے کہ اِسے غیب سے اُس کی تائید کا حکم دیا جاتا ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ ہدایت الٰہی اور علوم غیب کو پانے کے لیے کسی نبی یا فرشتے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ فرماتے ہیں:

فالحكيم لوجاهته وعصمته وكونه باسطًا لحظيرة القدس، شأنه شأن الملأ الأعلٰى، يتلقى العلوم من حيث يتلقون، لا يقلد أحدًا في علومه، اللّٰهم إلا أن يسمّٰى موافقته لصاحب الشرع تقليدًا لكونه مامورًا من الغيب بموافقته وتائيده.(اشارہ ۴، عبقہ ۱۱)

''پس اِس ہستی کا معاملہ اِس کی وجاہت و عصمت کی بنا پر اور اِس بنا پر کہ عالم قدس کی تجلیات اِسی سے پھیلتی ہیں، بالکل وہی ہوتا ہے جو آسمان کے فرشتوں کا ہے۔ یہ اپنے علوم وہیں سے حاصل کرتی ہے جہاں سے وہ حاصل کرتے ہیں اور اِس معاملے میں کسی کی مقلد نہیں ہوتی۔ ہاں، البتہ صاحب شریعت نبی کی تائید و موافقت کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لیے چونکہ یہ غیب سے مامور ہوتی ہے، اِس وجہ سے کوئی شخص اگر اِس تائید و موافقت کو اُس نبی کی تقلید کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔"

یہ ہستی جب زمین پر موجود ہوتی ہے تو حق وہی قرار پاتا ہے جو اِس کی زبان سے نکلتا اور اِس کے وجود سے صادر ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث کی حجت بھی اِس کے سامنے اِس کی اپنی حجت کے تابع ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

و إن الحق يدور معه حيث دار وذلک لعصمته والتحاقه بالملأ الأعلٰی، فليس الحق إلا ما سطع من صدره، فالحق تابع له لا متبوع. (اشارہ ۴، عبقہ ۱۱)

"اور حق جہاں یہ ہستی گھومتی ہے، اِس کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہستی ملاء اعلیٰ کے ساتھ شامل اور معصوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حق وہی قرار پاتا ہے جو اِس کے سینے سے نمایاں ہوتا ہے۔ پس حق اِس ہستی کے تابع ہوتا ہے، وہ حق کے تابع نہیں ہوتی۔"

صاحب "عوارف"[۲۵] نے غالباً اِسی مقام کے حامل شیخ تصوف کے بارے میں لکھا ہے:

فالشيخ للمريدين أمين الإلهام كما أن جبريل أمين الوحي، فكما لا يخون جبريل في الوحي، لا يخون الشيخ في الإلهام، و كما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ينطق عن الهوى فالشيخ مقتد برسول الله صلى الله عليه وسلم ظاهرًا وباطنًا لا يتكلم بهوى النفس.(۴۰۴)

"چنانچہ شیخ اپنے مریدوں کے لیے اُسی طرح الہام کا امین ہے، جس طرح جبریل امین وحی ہیں۔ پھر جس طرح جبریل وحی میں کوئی خیانت نہیں کرتے، اُسی طرح شیخ الہام میں خیانت نہیں کرتا اور جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتے، اُسی طرح شیخ بھی ظاہر و باطن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کرتا ہے، وہ بھی اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔"

۲۵۔ "عوارف المعارف"، شیخ ابو حفص عمر بن محمد شہاب الدین سہر وردی کی تصنیف ہے۔ شیخ عبد القاہر بن عبد اللہ سہر وردی کے بھتیجے اور بغداد میں صوفیہ کے شیخ تھے۔ ۵۳۹ھ میں سہر ورد میں پیدا ہوئے۔ ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔

چنانچہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اِن کے بعض اکابر بھی آسمان پر گئے، تجلیات کا نظارہ کیا اور وہاں آپ ہی کی طرح مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے۔ صاحب ''قوت القلوب''[26] بایزید بسطامی[27] کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے خود بیان کیا:

أدخلني في الفلک الأسفل فدورني في الملکوت السُّفلی فأراني الأرضين وما تحتها إلی الثریٰ، ثم أدخلني في الفلک العلوي فطوف بیفي السمٰوٰت وأراني ما فیھا من الجنان إلی العرش، ثم أوقفني بین یدیہ فقال لي: سلني أي شيء رأیت حتی أھبہ لک. (۷۰/۲)

''اللہ تعالیٰ مجھے فلک اسفل میں لے گئے اور ملکوت سفلی کی سیر کرائی، اِس طرح مجھے ساری زمینیں اور پاتال تک دکھائی، پھر فلک علوی میں لے گئے اور مجھے سارے آسمان اور اُن میں بہشت کے باغوں سے لے کر عرش بریں تک جو کچھ ہے، وہ سب دکھایا۔ اِس کے بعد مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا: مانگو جو کچھ تم نے دیکھا ہے، میں تمھیں دوں گا۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اُن کا عقیدہ ہے کہ انسان کامل کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہر زمانے میں اُن کے اکابر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عبد الکریم الجیلی[28] نے لکھا ہے:

إن الإنسان الکامل ھو القطب الذي تدور علیہ أفلاک الوجود من

''انسان کامل وہ مدار ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے سارے افلاک گردش کرتے ہیں،

۲۶۔ ''قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب''، علم تصوف کی سب سے بلند پایہ کتاب، غزالی نے اِس کے بیسیوں صفحے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں نقل کیے ہیں۔ شیخ عبد القادر جیلانی نے بھی ''فتوح الغیب'' میں اِس سے استفادہ کیا ہے۔ ابو طالب محمد بن علی الحارثی المکی کی تصنیف ہے۔ مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۳۸۶ھ میں، بغداد میں وفات پائی۔

۲۷۔ ابو یزید طیفور البسطامی، تیسری صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ 'سبحاني ما أعظم شأني!' (میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے)! اور 'تاللّٰہ، إن لوائي أعظم من لواء محمد' (خدا کی قسم، میرا علم محمد کے علم سے بڑا ہے)، جیسی خرافات اِنھی سے صادر ہوئیں۔ ۲۶۱ھ میں خراسان کے شہر بسطام میں اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔

۲۸۔ عبد الکریم قطب الدین الجیلی، جلیل القدر صوفی ہیں۔ ''الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوائل'' اِن کی مشہور تصنیف ہے۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ ۸۳۲ھ میں وفات پائی۔

أوله إلٰی آخره وهو واحد منذكان الوجود إلى أبد الآبدين، ثم له تنوع في ملابس و يظهر في كنائس فيسمى به باعتبار لباس، ولا يسمى به باعتبار لباس آخر، فاسمه الأصلي الذي هو له محمد وكنيته أبو القاسم ووصفه عبد الله ولقبه شمس الدين، ثم له باعتبار ملابس أخرى أسامي وله في كل زمان اسم ما يليق بلباسه في ذلک الزمان. فقد اجتمعت به صلى الله عليه وسلم وهو في صورة شيخي شرف الدين إسمٰعيل الجبرتي وكنت أعلم أنه النبي صلى الله عليه وسلم وكنت أعلم أنه الشيخ.(ورقہ ۴۶اب)[29]

اور جب وجود کی ابتدا ہوئی، اُس وقت سے لے کر ابدالآباد تک وہ ایک ہی ہے، پھر اُس کی گوناگوں صورتیں ہیں اور وہ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس کی ایک صورت کے لحاظ سے اُس کا ایک نام رکھا جاتا ہے، جب کہ دوسری صورت کے لحاظ سے اُس کا وہ نام نہیں رکھا جاتا۔ اُس کا اصلی نام محمد ہے۔ اُس کی کنیت ابو القاسم، وصف عبد اللہ اور لقب شمس الدین ہے؛ پھر دوسری صورتوں کے لحاظ سے اُس کے دوسرے نام ہیں، اور ہر زمانہ میں جو صورت وہ اختیار کرتا ہے، اُس کے لحاظ سے اُس کا ایک نام ہوتا ہے۔ میں نے اُسے اپنے شیخ شرف الدین اسمٰعیل الجبرتی کی صورت میں اِس طرح دیکھا کہ مجھے یہ بات بھی معلوم تھی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میرے شیخ ہیں۔“

وہ بالصراحت کہتے ہیں کہ ختم نبوت کے معنی صرف یہ ہیں کہ منصب تشریع اب کسی شخص کو حاصل نہ ہو گا۔ نبوت کا مقام اور اُس کے کمالات اُسی طرح باقی ہیں اور یہ اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ”فتوحات“[30] میں ہے:

فإن النبوة التي انقطعت بوجود رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما هي نبوة التشريع لا مقامها، فلا شرع يكون

”چنانچہ جو نبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی، وہ محض تشریعی نبوت ہے۔ نبوت کا مقام ابھی باقی ہے، اِس وجہ سے بات صرف یہ ہے کہ

۲۹۔ قلمی نسخہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

۳۰۔ فتوحات مکیہ، ابن عربی۔

ناسخًا لشرعه صلى الله عليه وسلم ولا يزيد في حكمه شرعًا آخر. وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: إن الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدي ولا نبي: أي لا نبي بعدي يكون على شرع مخالفًا لشرعي، بل إذا كان يكون تحتحكم شريعتي. (٦/٣)

اب کوئی نئ شریعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نہ منسوخ کرے گی اور نہ آپ کے قانون میں کسی نئے قانون کا اضافہ کرے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ نبوت و رسالت ختم ہو گئی، اِس لیے میرے بعد اب کوئی رسول اور نبی نہ ہو گا، درحقیقت اِسی مدعا کا بیان ہے۔ آپ کے اِس ارشاد کا مطلب یہی ہے کہ میرے بعد کوئی ایسا نبی نہیں ہو گا جس کی شریعت میری شریعت کے خلاف ہو، بلکہ وہ جب ہو گا تو میری شریعت ہی کا پیرو ہو گا۔"

شیخ احمد سرہندی لکھتے ہیں:

باید دانست کہ منصب نبوت ختم بر خاتم الرسل شدہ است علیہ و علی آلہ الصلوٰت والتسلیمات، اما از کمالات آں منصب بطریق تبعیت متابعان اور انصیب کامل است. (مکتوبات ۱، مکتوب ۲۶۰)

"جاننا چاہیے کہ منصب نبوت، بے شک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، لیکن اِس منصب کے کمالات آپ کے پیرووں کو آپ کے پیروہی کی حیثیت سے اب بھی پورے حاصل ہو سکتے ہیں۔"

اِس کے بعد وہ آگے بڑھتے ہیں اور حریم نبوت میں یہ نقب لگانے کے بعد ——— یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ، کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے لامکاں کی پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے علم و تصرف کا عالم کیا ہوتا ہے، قشیری [۳۱] لکھتے ہیں:

كان يرى جملة الكون يضئ بنور
كان له حتى لم يخف من الكون عليه

"اِس راہ کے سالک کو یہ سارا عالم اُس کے اپنے ہی نور سے روشن دکھائی دیتا ہے، یہاں تک کہ اُس

۳۱۔ ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری، اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ ۳۷۶ھ میں نیشا پور کے قصبہ استوا میں پیدا ہوئے۔ "الرسالۃ القشیریہ" اُن کی مشہور تصنیف ہے۔ ۴۶۵ھ میں اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔

شيئ، وكان يرى جميع الكون من السماء والأرض روية عيان ولكن بقلبه.(ترتيب السلوک ٦٧)

کی کوئی چیز اُس کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی۔ وہ آسمان سے زمین تک یہ ساری کائنات اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ ہاں، مگر دل کی آنکھوں کے سامنے۔''

''الانسان الکامل'' میں ہے:

فكل واحد من الأفراد والأقطاب له التصرف في جميع المملكة الوجودية ويعلم كل واحد منهم ما اختلج في الليل والنهار فضلاً عن لغات الطيور. وقد قال الشبلي رحمه الله تعالیٰ: لو دبت نملة سوداء علی صخرة صماء في ليلة ظلماء ولم أسمعها لقلت: إني مخدوع أو ممكور بي.

(ورقہ ۱۳۶ب)

''اِن افراد و اقطاب میں سے ہر ایک کو اِس پوری مملکت وجود میں تصرف حاصل ہوتا ہے۔ پرندوں کی بولیاں تو کیا، رات اور دن میں جو کھٹکا بھی ہوتا ہے، وہ اُس سے واقف ہوتے ہیں۔ شبلی نے کہا ہے: اگر کوئی کالی چیونٹی بھی اندھیری رات میں کسی سخت پتھر پر چلتی اور میں اُس کی آواز نہ سنتا تو بے شک، میں یہی کہتا کہ مجھے فریب دیا گیا ہے یا میں دھوکے میں رہا ہوں۔''

ابن عربی نے لکھا ہے:

وهم من العلم بحيث إذا رأی أحدهم أثروطأة شخص فيالأرض علم أنها وطأة سعيد أو شقي.

(فتوحات مکیہ ۳/ ۱۳)

''اُن کے علم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُن میں سے کوئی اگر کسی شخص کا نقش قدم بھی دیکھ لے تو اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اہل جہنم میں سے ہے یا اہل جنت میں سے۔''

وہ کہتے ہیں:

...حتی يهتف بك، وأنت لا تراه ويمشي علی الماء وفي الهواء و يصير كالهيولیٰ قابلاً للتشكيل والصور

''... یہاں تک کہ تم اُس کی آواز سنتے ہو، لیکن وہ تمھیں دکھائی نہیں دیتا، اور وہ پانی پر چلتا اور ہوا میں اڑتا ہے، اور ہیولا کی طرح ہر شکل اختیار کر

كالعالم الروحاني، مثل جبريل عليه السلام الذي كان ينزل تارة على صورة دحية و قد تجلى له صلى الله عليه وسلم وقد سد الآفاق وله ست مائة جناح.(مواقع النجوم ۶۵)

لینے اور ہر صورت بدل لینے کے قابل ہو جاتا ہے، جس طرح عالم روحانی کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ مثال کے طور پر جبریل علیہ السلام دحیہ کی صورت میں بھی آتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ اِس طرح بھی آئے کہ سارا افق اُن سے بھرا ہوا تھا اور آپ نے دیکھا کہ اُن کے چھ سو بازو ہیں۔''

چنانچہ خدا کی پادشاہی میں وہ اِس شان سے اُس کے شریک ہو جاتے ہیں کہ خامۂ تقدیر کو لوح محفوظ پر لکھتے ہوئے ہر لحظہ دیکھتے، دل کے خیالات کو جانتے، اِس عالم کو صبح و شام تھامتے، سنبھالتے اور عالم امر میں ذات خداوندی کا آلہ بن جاتے ہیں۔

ابن عربی لکھتے ہیں:

من الصوفية من لا يزال عاكفًا على اللوح.(مواقع النجوم ۲۲)

''صوفیوں میں سے وہ بھی ہیں، جن کی نگاہیں ہمیشہ لوح محفوظ ہی پر لگی ہوتی ہیں۔''

وہ فرماتے ہیں:

العارف هو الذي ينطق عن سرك وأنت ساكت.(مواقع النجوم ۲۶)

''عارف، در حقیقت وہی ہے جو تجھ سے کچھ سنے بغیر تیرے دل کی بات تجھے بتادے۔''

اپنے 'مردان غیب'[۳۲] میں سے اوتاد کے بارے میں اُنھوں نے لکھا ہے:

۳۲۔ صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ زمین پر اللہ کے خاص بندوں کی ایک جماعت ہمیشہ موجود رہتی ہے جو اِس عالم کا سب کام جاری رکھتے ہیں۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اُن کی مرضی کے تابع اور روز و شب کا یہ سلسلہ اُن کے احکام کا پابند ہوتا ہے۔ اللہ کے یہ بندے چونکہ اِس حیثیت سے عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اِس وجہ سے اِنھیں مردان غیب، اولیاے مکتوم یا رجال الغیب کہتے ہیں۔ قطب اِن کا امام ہوتا ہے۔ اُسے قطب الارشاد، غوث اور قائم الزماں بھی کہا جاتا ہے۔ اُس کے ماتحت دو وزیر ہوتے ہیں جو امام کہلاتے ہیں۔ اِن کے بعد اوتاد کا منصب ہے جو بعض کے نزدیک چار اور بعض کے نزدیک سات ہیں۔ ابن عربی کا بیان ہے کہ اُن میں سے ایک کے ساتھ، جس کا نام ابن جعدون تھا، شہر فاس

الواحد منهم يحفظ الله به المشرق وولايته فيه، والآخر المغرب، والآخر الجنوب والآخر الشمال، والتقسيم من الكعبة، وهؤلاء قد يعبر عنهم بالجبال لقوله تعالٰى: "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا". فإنه بالجبال سكن ميد الأرض، كذلك حكم هؤلاء في العالم حكم الجبال في الأرض.

(فتوحات مکیہ ۲/۱۲)

"اُن میں سے ایک کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مشرق کی حفاظت کرتے ہیں اور اُس کی ریاست اِسی میں ہے۔ دوسرے تین مغرب، جنوب اور شمال کی حفاظت پر مامور ہیں۔ سمتوں کا یہ تعین بیت اللہ سے ہوتا ہے۔ یہی وہ اشخاص ہیں جنھیں ارشاد خداوندی 'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا'[۳۳] کی بنا پر کبھی کبھی 'جبال'، یعنی پہاڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہاڑ ہی ہیں جو زمین کو جھک پڑنے سے روکتے ہیں۔ اِن اشخاص کا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہ زمین کے پہاڑوں ہی کی طرح اِس عالم کو تھامے رہتے ہیں۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی[۳۴] اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

رأيتني في المنام قائم الزمان، أعني بذلک أن الله إذا أراد شيئًا من نظام

"میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے قائم الزماں کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اِس سے میری مراد

میں اُن کی ملاقات بھی ہوئی۔ خود ابن عربی کا دعویٰ ہے کہ وہ قطب کے مقام پر فائز تھے۔ ہندوستان کے صوفیہ میں سے شیخ احمد سرہندی بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُنھیں قطب الارشاد کا خلعت عطا ہوا۔ ابن عربی کے نزدیک سب سے آخری درجہ ختم کا ہے جس پر اولیاے امت کے یہ سب مناصب ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے لیے اِس منصب کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ابدال، نقبا، نجبا وغیرہ کے مناصب اِن کے نیچے ہیں۔

اِس باب کی تفصیلات کوئی شخص اگر چاہے تو ابن عربی کی "فتوحات مکیہ"، ابو طالب مکی کی "قوت القلوب"، علی ہجویری کی "کشف المحجوب" اور الجیلی کی "الانسان الکامل" میں دیکھ لے سکتا ہے۔

۳۳۔ النبا ۷۸: ۶-۷۔ "کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا۔"

۳۴۔ احمد بن عبد الرحیم شاہ ولی اللہ فاروقی دہلوی۔ "حجۃ اللہ البالغہ"، "التفہیمات الالٰہیہ"، "ازالۃ الخفا" اور "الانصاف" کے مصنف، جلیل القدر صوفی، مفکر اور عالم۔ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷۶ھ میں دہلی میں وفات پائی۔

الخير جعلني كالجارحة لإتمام مراده. (فیوض الحرمین، مشاہدہ ۴۴)

یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے نظام خیر میں سے کسی چیز کا ارادہ کریں گے تو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے آلۂ کار مجھے بنائیں گے۔''

یہی مقام ہے، جس پر پہنچنے کے بعد پھر وہ کہتے ہیں: 'معاشر الأنبياء، أوتيتم اللقب، وأوتينا ما لم تؤتوا'،[۳۵] اے جماعت انبیا، تمھیں صرف نبی کا لقب دیا گیا اور ہمیں وہ کچھ دیا گیا جس سے تم محروم ہی رہے۔

قرآن جس دین کو لے کر نازل ہوا ہے، اُس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان سے اُس کے خالق کو جو اصل چیز مطلوب ہے، وہ اُس کی عبادت ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (الذّٰریٰت ۵۱:۵۶)

''اور جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر انسان کو اِسی حقیقت سے آگاہ کر دینے کے لیے بھیجے تھے۔ سورۂ نحل میں ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (۱۶:۳۶)

''اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اِس دعوت کے ساتھ اٹھایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

اِس سے جو تعلق انسان اور اُس کے خالق کے مابین قائم ہوتا ہے، وہ عبد اور معبود کا تعلق ہے، اور انسان کی ساری سعی وجہد کا مقصود اِس دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت کا حق اِس طرح ادا کرے کہ دنیا اور آخرت میں اُس کی رضا اُسے حاصل ہو جائے۔

اہل تصوف کے دین میں، اِس کے برخلاف انسان چونکہ ذات خداوندی ہی کے ایک تعین کا نام ہے، اور اِس تعین کی وجہ سے وہ چونکہ عالم لاہوت سے اِس عالم ناسوت میں آپڑا ہے، اِس لیے جو چیز اصلاً اُس سے مطلوب ہے، وہ اپنی اِس حقیقت کی معرفت اور اِس کی طرف رجعت کی جدوجہد ہے۔ چنانچہ انسان کا جو تعلق اِس دین میں ذات خداوندی سے قائم ہوتا ہے، وہ عاشق و معشوق کا تعلق ہے۔ وہ اپنی اصل حقیقت، یعنی ذات خداوندی کو معشوق قرار دے کر اُس کے ہجر میں تڑپتا، نالہ کھینچتا، فریاد کرتا اور پھر کسی مرشد کی رہنمائی میں پہلے اِس حقیقت

۳۵۔ فتوحات مکیہ، ابن عربی ۳/۱۳۶، عن امام العصر عبد القادر۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کی معرفت حاصل کرتا اور پھر مقام جمع تک رسائی حاصل کر کے اپنے معشوق سے واصل ہو جاتا ہے۔

صاحب ''منازل'' اپنی کتاب میں اِس 'جمع' کو 'غاية مقامات السالكين' قرار دیتے اور اِس کی تعریف میں فرماتے ہیں:

الجمع: ما أسقط التفرقة وقطع الإشارة وشخص عن الماء والطين بعد صحة التمكين والبراءة من التلوين والخلاص من شهود الثنوية والتنافي من إحساس الاعتلال والتنافي من شهود شهودها.

(منازل السائرین ۴۶)

''جمع وہ مقام ہے، جو خالق و مخلوق کے مابین اُن کی حقیقت کے اعتبار سے تفرقہ مٹا دے اور اشارہ[36] ختم کر دے اور آب و گل سے اِس طرح رحلت کرے کہ حادث پوری صحت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محو اور قدیم ثابت ہو،[37] اور اِس محو و اثبات کے مابین تردد کی ہر صورت سے براءت ہو جائے[38] اور دوئی کے شہود سے نجات پالی جائے اور علت و معلول کا احساس فنا ہو جائے، یہاں تک کہ اِن سب چیزوں پر اطلاع پانے کی اطلاع بھی باقی نہ رہے۔''

مثنوی کی ابتدا میں یہی بات ہے جسے رومی نے اپنے لافانی اشعار میں اِس طرح بیان کیا ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

۳۶۔ مطلب یہ ہے کہ ثنویت اِس طرح ختم ہو جائے کہ نہ کوئی مشیر رہے اور نہ کوئی مشار الیہ۔

۳۷۔ اصل میں لفظ 'تمکین' استعمال ہوا ہے۔ یہ علم تصوف کی اصطلاح ہے اور اِس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے اپنے ترجمہ میں واضح کر دیے ہیں۔

۳۸۔ اصل میں لفظ 'تلوین' آیا ہے۔ یہ بھی ایک اصطلاح ہے اور علم تصوف میں سالک کی اُس حالت کے لیے مستعمل ہے، جب وہ حادث کے اثبات و محو کے مابین متردد ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

موت اور قیامت اِن مقامات کے حاملین کے لیے یہی رجعت اور وصال ہے۔ لہٰذا اِس کی یاد میں جو تقریب منعقد کی جاتی ہے، اُسے 'عرس'، یعنی تقریب نکاح کہا جاتا ہے۔ تصوف کی ساری شاعری اِسی معاملۂ عشق کا بیان ہے، جس سے ایک ہی وقت میں عامی بادۂ انگور کے مزے لیتے، اور عارف بادۂ عرفان کی لذت پاتے ہیں:

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

شریعت و طریقت

قرآن نے جو دین ہمیں دیا ہے، اُس کے بارے میں یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا ہے، اور اُس میں اب کسی اضافے یا کمی کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ پھر یہی نہیں، قرآن نے بتایا ہے کہ اِس اکمال دین کی صورت میں اتمام نعمت بھی ہوا ہے، لہٰذا عوام و خواص کے وہ سب مراتب جو دین میں مطلوب ہیں، اُن کے لیے ساری ہدایت اُسی میں ہے، اُس سے باہر کسی کے لیے کوئی ہدایت نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدہ ۵:۳)

"آج میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے، اور (اِس طرح) اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، اور تمھارے لیے دین اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔"

چنانچہ اِسی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبات میں فرمایا کرتے تھے:

فإن خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد وشر الأمور محدثاتها وكل بدعة ضلالة. (مسلم، رقم ۲۰۰۵)

"بہترین کتاب اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت (اللہ کے پیغمبر) محمد کی ہدایت ہے اور سب سے بری باتیں وہ ہیں جو اِس دین میں نئی پیدا کی جائیں، اور اِس طرح کی ہر نئی بات گم راہی ہے۔"

اہل تصوف کے دین میں اللہ تعالیٰ کی یہ ساری ہدایت جو قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہے، در حقیقت لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک عمومی ضابطہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ کوئی چیز اگر حاصل کی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ظلم اور آخرت کے عذاب سے نجات پا لیں۔ رہا اِس سے آگے خواص اور اخص الخواص

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے مراتب فنا و بقا اور تمکین تام تک پہنچنے کا طریقہ، تو یہ ہدایت نہ اِس کے لیے آئی ہے، اور نہ اِس طرح کی کوئی چیز اِس میں کسی شخص کو کبھی تلاش کرنی چاہیے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی کتاب ''الطاف القدس'' میں لکھتے ہیں:

وعلت غائیہ آں اخلاص ازتظالم در دنیا و مبتلا شدن بعذاب قبر و روز حشر است، نہ وصول بفنا و بقاے ہر لطیفہ و حصول مرتبۂ بقاے مطلق و تمکین تام۔ ہر کلامے ازاں خلاصۂ بشر علیہ افضل الصلوٰت والتسلیمات کہ بتو رسد محمل آں فی الحقیقت ہماں قدر است۔ مقاصد و مصالح او امر و نواہی آں حضرت نشناختہ است کسے کہ بر مراتب دیگر حمل می کند۔ (۱۴)

''اور اِس (شریعت) کا مقصود یہ ہے کہ لوگ دنیا میں ایک دوسرے کے ظلم اور (مرنے کے بعد) قبر اور حشر کے عذاب سے بچ جائیں۔ ہر لطیفہ کی فنا و بقا تک پہنچنا اور بقاے مطلق اور تمکین تام کا مرتبہ حاصل کرنا اِس میں پیش نظر ہی نہیں ہے۔ جو کلام بھی خلاصۂ بشر صلی اللہ علیہ وسلم سے تمھیں پہنچے، اُس کا محمل در حقیقت یہی مقدار ہے۔ آپ نے جو احکام دیے اور جن چیزوں سے روکا ہے، اُن کے مقاصد اور مصالح اُس شخص نے سمجھے ہی نہیں جو اُنھیں دوسرے مراتب پر محمول کرتا ہے۔''[39]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لیکن یہ لطائف فنا و بقا اور تمکین تام پھر کہاں سے حاصل ہوں؟ شاہ ولی اللہ اِسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اِن کا علم سب سے پہلے سید الطائفہ جنید بغدادی نے مرتب فرمایا، اور اِسے قرآن و سنت سے نہیں، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست اِس طرح اخذ کیا ہے، جس طرح مثال کے طور پر، خربوزہ آفتاب سے اپنی نشو و نما اور تکمیل کے لیے کسب فیض کرتا ہے، دراں حالیکہ نہ خربوزہ جانتا ہے کہ اُس کی تکمیل آفتاب کی مرہون منت ہے اور نہ آفتاب ہی کو کچھ خبر ہوتی ہے کہ اُس سے دور زمین پر کوئی خربوزہ اُس کے ذریعے سے اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

بہ ہمیں اسلوب نفوس کلیہ کہ مبدء فیض ایشاں را براے مصلحت کلیہ بزمین فرود آوردہ است،

''یہی طریقہ ہے[40] جس سے نفوس کلیہ جنھیں مبدء فیض نے مصلحت کلی کے لیے زمین پر اتارا

۳۹۔ یعنی اُن سے یہ لطائف فنا و بقا اور تمکین تام وغیرہ استنباط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۰۔ یعنی وہ طریقہ جو اوپر خربوزے اور آفتاب کی مثال میں بیان ہوا ہے۔

نفوس ناقصہ را مکمل می سازند۔ و ایں جا ہیچ پیغامی و کلامی درمیاں نمی باشد۔ آرے اذکیا نفوس بوجہی از وجوہ ایں منت رامی شناسند و آں معنی حاصل برآں می شود کہ از کلمات و اقوال آں برزخ بر سبیل اعتبار و اشارہ استنباط آں اسرار کنند۔(۱۴)

ہے، ناقص لوگوں کی تکمیل کرتے ہیں، اور اِس جگہ کوئی پیغام و کلام اُن کے درمیان نہیں ہوتا۔ ہاں، ذکی طبیعتیں کسی نہ کسی طرح اِس عنایت کو پہچان لیتی ہیں اور اِس کا نتیجہ اُن کے لیے یہ نکلتا ہے کہ اُس برزخ، (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و کلمات سے اعتبار و اشارہ کے طور پر وہ اُن اسرار کا استنباط کر لیتی ہیں۔''

یہ صاحب ''الطاف القدس'' کا اسلوب ہے۔ اِس زمانے کے اہل تصوف اِس معاملے میں اپنے مدعا کی تقریر بالعموم اِس طرح کرتے ہیں کہ دین کا منتہاے کمال ''احسان'' ہے۔ اِس کے حصول کا کوئی طریقہ قرآن وسنت میں بیان نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتا تھا، لیکن آپ کے بعد جب اِس کا حصول لوگوں کے لیے مشکل ہوا تو یہ ارباب تصوف تھے، جنھوں نے اپنے اجتہاد سے اِس کے طریقے دریافت کیے، اور بالآخر ایک فن کی صورت میں اِسے بالکل مرتب کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جسے ہم ''طریقت'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔

رشید احمد گنگوہی[41] فرماتے ہیں:

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت روحانی کی یہ حالت تھی کہ بڑے سے بڑے کافر کو 'لا إلٰه إلا الله' کہتے ہی مرتبۂ ''احسان'' حاصل ہو جاتا تھا جس کی ایک نظیر یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم پاخانہ پیشاب کیسے کریں اور حق تعالیٰ کے سامنے ننگے کیوں کر ہوں؟ یہ انتہا ہے۔ اور اُن کو مجاہدات اور ریاضات کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور یہ قوت بہ فیض نبوی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں تھی، مگر جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کم تھی، اور تابعین میں تھی، مگر صحابہ سے کم تھی، لیکن تبع تابعین میں یہ قوت بہت ہی کم ہو گئی، اور اِس کی تلافی کے لیے بزرگوں نے مجاہدات اور ریاضات ایجاد کیے۔''[42] (ارواح ثلاثہ ۲۹۷)

۴۱۔ حلقۂ دیوبند کے جلیل القدر عالم اور شیخ تصوف۔ ہندوستان کے ایک قصبہ گنگوہ میں مدفون ہیں۔ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

۴۲۔ دوسرے لفظوں میں بیان کیجیے تو گویا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکمال دین اور اتمام نعمت کے باوجود

چنانچہ اِس تصور کے تحت اور ادواشغال اور چلوں اور مراقبوں کی ایک پوری شریعت[۴۳] ہے جو خدا کی شریعت سے آگے اور قرآن و سنت سے باہر، بلکہ اُن کے مقاصد کے بالکل خلاف اِن اہل تصوف نے طریقت کے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے، اور اِس کے بارے میں وہ برملا کہتے ہیں کہ اِس کا علم جس طرح ہمارے مشائخ سے تعلق پیدا کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے، اُس طرح کسی دوسرے طریقے سے اِس کا حصول اب لوگوں کے لیے آسان نہیں رہا۔

پھر یہی نہیں، محاسن اخلاق، یعنی صبر، شکر، صدق، ایثار، رضا، حیا، تواضع، توکل اور تفویض وغیرہ کے جو درجات اِس دین میں بیان کیے جاتے ہیں، اُن کے لحاظ سے اللہ کے پیغمبر اور اُن کے صحابہ کو بھی دیکھیے تو بہ مشکل پہلے یا دوسرے درجے تک ہی پہنچتے معلوم ہوتے ہیں۔ صاف واضح ہوتا ہے کہ اِس سے آگے اخص الخواص کے درجے تک اُن کی رسائی بھی نہیں ہو سکی۔ تصوف کی امہات کتب میں سے مثال کے طور پر ابو طالب مکی کی ''قوت القلوب''، ابو اسمٰعیل ہروی کی ''منازل السائرین'' اور غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' کا ایک بڑا حصہ اِنھی مباحث کے لیے خاص ہے۔ اِن کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اِس معاملے میں جو آخری مقامات اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں مقرر کیے ہیں، اہل تصوف کا ہدف اُن سے فی الواقع بہت آگے ہے۔

یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ ہماری یہ تحریر اِس موضوع پر کسی مفصل بحث کے لیے نہیں ہے۔ تاہم ان چند نکات ہی سے پوری طرح واضح ہے کہ تصوف فی الواقع ایک متوازی دین ہے، جسے دین خداوندی کی روح اور حقیقت کے نام سے اِس امت میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللّٰھم أرنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه، وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن و سنت کی ہدایت میں جو کمی اِن بزرگوں کے نزدیک رہ گئی تھی، وہ بہ کمال عنایت اپنے اجتہادات سے اُنھوں نے پوری کر دی ہے۔

۴۳۔ اِس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''القول الجمیل فی بیان سواء السبیل''۔

میزان

جاوید احمد غامدی

اصول و مبادی

(۸)

مبادیِ تدبرِ قرآن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

○ محکم اور متشابہ

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیز نہیں کر سکتے یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قرآن کی وہ سب آیتیں محکم ہیں جن پر اس کی ہدایت کا مدار ہے اور متشابہات صرف وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماورا اُس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے، مثلاً آدم میں اللہ تعالیٰ کا اپنی روح پھونکنا یا سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا کرنا یا جنت اور جہنم کے احوال و مقامات وغیرہ۔ وہ سب چیزیں جن کے لیے ابھی الفاظ وجود میں نہ آئے ہوں، انھیں تمثیل اور تشبیہ کے اسلوب ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کسی نادیدہ عالم کے حقائق دنیا کی سب زبانوں کے ادب میں اسی طرح بیان کیے جاتے ہیں۔ آج سے دو صدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ انھیں آگ دکھانے کی ضرورت ہو گی۔ متشابہ آیات کی نوعیت بالکل یہی ہے۔ وہ نہ غیر متعین ہیں اور نہ ان کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ ان کے الفاظ عربیِ مبین

ہی کے الفاظ ہیں اور ان کے معنی بھی ہم بغیر کسی تردد کے سمجھتے ہیں۔ہاں، یہ ضرور ہے کہ ان کی حقیقت ہم اس دنیا میں نہیں جان سکتے، لیکن اس جاننے یا نہ جاننے کا قرآن کے فہم سے چونکہ کوئی تعلق نہیں ہے،اس لیے کسی صاحبِ ایمان کو اس کے درپے بھی نہیں ہونا چاہیے۔استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں، وہ بجاے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے، جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے، البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے، اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدرِ استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علمِ الٰہی کے حوالے کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات وافعال یا آخرت کی نعمتوں اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے، اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھالیتا ہے، یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل و صورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔“(تدبرِ قرآن، ج ۲، ص ۲۵-۲۶)

قرآن کی جس آیت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ متشابہات کا مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ متشابہات کے معنی اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اس کے لیے اصل میں ’تاویل‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں یہ سورۂ یوسف میں آیا ہے: ’قال یابت ھذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلھا ربی حقاً‘[۲۰] (اس نے کہا: ابا جان، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے ثابت کر دکھایا ہے)۔ یہ خواب جن لفظوں میں قرآن نے بیان کیا ہے، اُن کے معنی ہر شخص پر واضح ہیں۔ عربی زبان کا ایک عام طالب علم بھی قرآن کی اُس آیت کا مفہوم جس میں یہ خواب بیان ہوا ہے[۲۱] بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتا ہے، لیکن سورج اور چاند اور اُن گیارہ ستاروں کا مصداق کیا تھا جنھیں

۲۰۔ ۱۲: ۱۰۰۔

۲۱۔ ۱۲: ۴۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے دیکھا؟ اس سے پوری قطعیت کے ساتھ کوئی شخص اُس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا تھا جب تک یہ مصداق اپنی اصل صورت میں لوگوں کے سامنے نہ آ جاتا۔ متشابہ قرآن نے انھی چیزوں کو کہا ہے۔ اس کے معنی جس طرح کہ لوگ بالعموم سمجھتے ہیں، مشتبہ اور مبہم کے نہیں ہیں کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کے لیے میزان اور فرقان ہے، کسی حیثیت سے مجروح ہو۔

آیت یہ ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

(آل عمران ۳:۷)

”وہی ہے جس نے تم پر کتاب اتاری جس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو کتاب کی بنیاد ہیں اور کچھ دوسری متشابہ،[۲۲] پھر جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں، اِس لیے کہ فتنہ پیدا کریں اور اِس لیے کہ اُن کی حقیقت جان لیں، دراں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جنھیں علم میں رسوخ عطا ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اِن پر ایمان لائے ہیں، یہ سب ہمارے پروردگار کے پاس ہی سے آیا ہے اور ان سے نصیحت تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔“

(باقی)

۲۲۔ محکم اور متشابہ کے الفاظ اِس آیت میں اُس خاص اصطلاحی مفہوم کے لیے آئے ہیں جس کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر یہی دونوں لفظ اس سے مختلف معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں، یعنی محکم جامعیت اور ایجاز کی حامل آیتوں کے لیے اور متشابہ ہم رنگ اور ہم آہنگ کے مفہوم میں۔ ملاحظہ ہو: ہود ۱۱:۱ اور الزمر ۳۹:۲۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ معیشت

(۴)

۵۔ اکل الاموال بالباطل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ. (النساء۴: ۲۹)

''ایمان والو، تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، الا یہ کہ وہ رضامندی کی تجارت سے کسی کو حاصل ہو جائے۔''

اس آیت میں دوسروں کا مال ان طریقوں سے کھانے کی ممانعت کی گئی ہے جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہیں۔ اسلام میں معاشی معاملات سے متعلق تمام حرمتوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ چوری، غصب، غلط بیانی، تعاون علی الاثم، غبن، خیانت اور لقطہ کی مناسب تشہیر سے گریز کے ذریعے سے دوسروں کا مال لے لینا، یہ سب اسی کے تحت داخل ہیں۔ ان چیزوں پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ان کا گناہ ہونا تمام دنیا کے معروفات اور ہر دین و شریعت میں ہمیشہ مسلم رہا ہے۔ وہ معاملات جو دوسروں کے لیے ضرر و غرر، یعنی نقصان یا دھوکے کا باعث بنتے ہیں، وہ بھی اسی کی ایک فرع ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو صورتیں، اپنے زمانے میں ممنوع قرار دیں، وہ یہ ہیں:

مچھلی کو پانی ہی میں بیچ دینا۔[13]

۱۳۔ احمد بن حنبل، ج۱ص۳۸۸۔

جانوروں کے بچے، وضعِ حمل سے پہلے، ان کے پیٹ ہی میں فروخت کر دینا۔[14]

دودھ بیچنا، جب وہ تھنوں میں ہو، الا یہ کہ اس کی مقدار متعین کر لی جائے۔[15]

مالِ غنیمت بیچنا، اس سے پہلے کہ وہ تقسیم ہو جائے۔[16]

کوئی چیز بیچنا، اس سے پہلے کہ وہ قبضہ میں آئے۔[17]

غلام بیچنا، دراں حالیکہ وہ اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہو۔[18]

ڈھیر کے حساب سے غلہ خرید کر، اسے اپنے ٹھکانوں پر لانے سے پہلے بیچ دینا۔[19]

دیہاتی کے لیے کسی شہری کی خرید و فروخت۔[20]

محض دھوکا دینے کے لیے، ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینا۔[21]

کسی شخص کے سودے پر اپنا سودا بنانے کی کوشش کرنا۔[22]

ضربتہ الغائص، یعنی غوطہ لگانے والے سے اس طرح کا معاملہ کیا جائے کہ اس کی ایک بڑکی میں جو کچھ اس کے ہاتھ لگے گا، وہ اتنی رقم میں اس سے خرید لیا جائے گا۔[23]

خرید و فروخت میں دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا۔[24]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۴۔ احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۴۲۔

۱۵۔ احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۴۲۔

۱۶۔ احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۴۲۔

۱۷۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۵۴۔

۱۸۔ احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۴۲۔

۱۹۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۵۶۔

۲۰۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۵۸۔

۲۱۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۵۸۔

۲۲۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۵۸۔

۲۳۔ احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۴۲۔

۲۴۔ احمد بن حنبل، ج ۱ ص ۱۱۶۔

محاقلہ، یعنی کوئی شخص اپنی کھیتی خوشہ ہی میں بیچ دے۔[25]

مزابنہ، یعنی کھجور کے درخت پر اس کا پھل درخت سے اتری ہوئی کھجور کے عوض بیچنا۔[26]

معاومہ، یعنی درختوں کا پھل کئی سال کے لیے بیچ دینا۔[27]

ثنیا، یعنی بیع میں کوئی مجہول استثنا باقی رکھا جائے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ غلہ بیچنے والا، مثال کے طور پر یہ کہہ دیتا کہ میں نے یہ غلہ تیرے ہاتھ بیچ دیا، مگر اس میں سے تھوڑا نکال لوں گا۔[28]

ملامسہ، یعنی ہر ایک دوسرے کا کپڑا بے سوچے سمجھے چھو لے اور طرح اس کی بیع منعقد ہو جائے۔[29]

منابذہ، یعنی ہر ایک اپنی کوئی چیز دوسرے کی طرف پھینک دے اور اس طرح اس کی بیع منعقد ہو جائے۔[30]

بیعِ عربان، یعنی پیشگی دی ہوئی رقم اگر سودا نہ ہو سکے تو بائع کا حق قرار پائے۔[31]

بیع الی حبل الحبلہ، یعنی اونٹ اس طرح بیچے جائیں کہ اونٹنی جو کچھ جنے، پھر اس کا بچہ حاملہ ہو اور جنے تو اس کا سودا طے ہوا۔[32]

بیع الحصاۃ، یعنی کنکری کی بیع۔ اس کی دو صورتیں بالعموم رائج تھیں: ایک یہ کہ اہلِ جاہلیت زمین کا سودا طے کر لیتے، پھر کنکری پھینکتے اور جہاں تک وہ جاتی، اسے زمین کی مساحت قرار دے کر مبیع کی حیثیت سے خریدار کے حوالے کر دیتے، دوسری یہ کہ کنکری پھینکتے اور کہتے کہ یہ جس چیز پر پڑے گی، وہی مبیع قرار پائے گی۔[33]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۵۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۳۔

۲۶۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۳۔

۲۷۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۳۔

۲۸۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۳۔

۲۹۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۔

۳۰۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ۶۲۔

۳۱۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب ۲۲۔

۳۲۔ بخاری، کتاب السلم، باب ۸۔

۳۳۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۲۔

درختوں کے پھل بیچ دینا، اس سے پہلے کہ ان کی صلاحیت واضح ہو۔[34]

بالی بیچ دینا، اس سے پہلے کہ وہ سفید ہو کر آفتوں سے محفوظ ہو جائے۔[35]

اون بیچ دینا، درآں حالیکہ وہ جانور کے جسم پر ہو۔[36]

گھی بیچ دینا اس سے پہلے کہ وہ دودھ سے نکال لیا جائے۔[37]

اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی ایسی چیز بیچنا جس میں عیب ہو، الا یہ کہ اسے واضح کر دیا جائے۔[38]

اونٹ یا بکری کا دودھ، انھیں بیچنے سے پہلے ان کے تھنوں میں روک کر رکھنا۔[39]

بازار میں پہنچنے سے پہلے آگے جا کر تاجروں سے ملنا اور ان کا مال خریدنے کی کوشش کرنا۔[40]

کسی چیز کی پیشگی قیمت دے کر اس طرح بیع کرنا کہ تیار ہونے پر وہ چیز لے لی جائے گی، الا یہ کہ معاملہ ایک معین ماپ اور ایک معین تول کے ساتھ اور ایک معین مدت کے لیے کیا جائے۔[41]

مخابرہ، یعنی بٹائی کی وہ صورتیں اختیار کی جائیں جن میں کھیتی والے کا منافع معین قرار پائے۔[42]

زمین اس طرح بٹائی پر دینا کہ زمین کے ایک معین حصے کی پیداوار زمین کے مالک کا حق قرار پائے۔[43]

ایسی جائدادیں جو ابھی تقسیم نہ ہوئی ہوں، ان کے شریکوں کو خریدنے کا موقع دیے بغیر انھیں بیچ دینا الّا یہ کہ

۳۴۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۶۲۔

۳۵۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۵۰۔

۳۶۔ بیہقی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی النہی عن بیع الصوف۔

۳۷۔ بیہقی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی النہی عن بیع الصوف۔

۳۸۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب ۴۵۔

۳۹۔ بخاری، کتاب السلم، باب ۶۴۔

۴۰۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۴۔

۴۱۔ بخاری، کتاب السلم، باب ۷۔

۴۲۔ مسلم، کتاب البیوع، باب ۱۳۔

۴۳۔ بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب ۷۔

حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ کر دیے جائیں۔[44]

ہمسایے کے ساتھ راستہ ایک ہو تو اپنی جائداد اسے خریدنے کا موقع دیے بغیر بیچ دینا۔[45]

عام ضرورت کی چیزیں منڈی میں ان کی قلت پیدا کرنے اور اس طرح قیمت بڑھانے کے لیے روک رکھنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شدت کے ساتھ اسے ممنوع قرار دیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

من احتکر طعاماً اربعین لیلة فقد بریء من اللہ تعالیٰ وبریء اللہ تعالیٰ منه. (احمد بن حنبل، ج۲ص۳۳)	''جس نے کھانے کی کوئی چیز چالیس دن تک روکے رکھی اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ سے دور ہوا اور اللہ اس سے دور ہوا!''
من دخل فی اسعار المسلمین لیغلیه علیهم، کان حقاً علی اللہ تبارک تعالیٰ ان یقعده من النار یوم القیامة. (احمد بن حنبل، ج۵ص۲۷)	''جس نے چیزوں کے بھاؤ چڑھانے کے لیے مسلمانوں کے بازار میں کوئی مداخلت کی تو اللہ تعالیٰ یہ حق رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بڑی آگ کو اس کاٹھکانا بنادیں!''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بیع و شرا اور مزارعت وغیرہ کی یہ صورتیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ ضرر و غرر کی جس علت پر یہ مبنی ہیں، وہ اگر شرائط و احوال کی تبدیلی سے کسی وقت ان میں مفقود ہو جائے تو جس طرح ان کی ممانعت ختم ہو جائے گی، اسی طرح تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں یہ علت اگر کسی حادث معاشی معاملے میں ثابت ہو جائے تو اس کی اباحت بھی لازماً ختم قرار پائے گی۔

رشوت، جوا اور سود بھی اسی اکل الاموال بالباطل میں داخل اور اس سلسلہ کے بدترین جرائم ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر ہم یہاں کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔

رشوت

سورۂ بقرہ میں اسی 'لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل' کے حکم پر عطف کر کے، اللہ تعالیٰ نے

۴۴۔ بخاری، کتاب الشفعة، باب ۱۔

۴۵۔ ترمذی، کتاب الاحکام، باب ۳۲۔

فرمایا ہے:

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.(۲:۱۸۸)

''اور اس (مال) کو حکام تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے کھا جاؤ، دراں حالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو۔''

یہ آیت رشوت پر جن پہلوؤں سے روشنی ڈالتی ہے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

''ایک تو یہ کہ یہ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہاں دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر اسی چیز کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ قانون جو لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی افادیت کا تمام تر انحصار ... حکام کی راست روی اور دیانت پر ہے۔ وہی قانون کے اصلی محافظ ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان کو کسی ذریعہ سے بد دیانت بنا دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حقوق بکاؤ مال ہیں۔ جس کے پاس پیسے ہوں، وہ ان کو خرید سکتا ہے۔ رشوت حکام کو بد دیانت بنانے کا ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔

دوسرا یہ کہ رشوت کی گرم بازاری میں سب سے زیادہ مؤثر عامل خود معاشرہ ہے۔ جب لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح حاکم کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں، پھر جب ان کے منہ رشوت کا خون لگ جاتا ہے تو وہ اس کے ایسے رسیا ہو جاتے ہیں کہ وہ رشوت لیے بغیر لوگوں کو خود ان کے واجبی حقوق بھی نہیں دیتے، اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بد آموزی سے چور نہ بناؤ اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لیے ان کو قبول کرنے کو بھی، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، پسند نہیں کیا، اس لیے کہ یہ بھی رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔

تیسرا یہ کہ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں۔ عقل اس کی گواہ ہے، فطرتِ انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ 'وانتم تعلمون' (اور تم اس بات کو جانتے ہو)۔'' (تدبرِ قرآن ج ۱ ص ۴۶۵)

رشوت کے یہ پہلو ہیں، جن کی بنا پر اس کے دینے اور لینے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ملعون قرار پائے ہیں۔ ابوداؤد میں ہے:

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی.(کتاب الاقضیۃ)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور رشوت لینے والے، دونوں پر لعنت کی ہے۔“

جوا

جوئے کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نری قسمت آزمائی ہے۔ قرآنِ مجید نے اسے 'رجس من عمل الشیطان' (نجس، شیطانی کاموں میں سے) قرار دیا ہے۔ اس کے لیے یہ تعبیر، بالبداہت واضح ہے کہ اس اخلاقی فساد کی بنا پر اختیار کی گئی ہے جو اس سے آدمی کی شخصیت میں پیدا ہوتا اور بتدریج اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی عمل کی بنیاد اگر حقوق و خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھی جائے تو اس سے جس طرح انسان میں اخلاقِ عالیہ کے داعیات کو قوت حاصل ہوتی ہے اسی طرح اس کی بنیاد اگر محض اتفاقات اور قسمت آزمائی پر رکھ دی جائے تو اس کے نتیجے میں محنت، زحمت، خدمت اور جاں بازی سے گریز کا رویہ انسان میں پیدا ہو جاتا ہے، پھر بزدلی و کم ہمتی اور اس طرح کے دوسرے اخلاقِ رذیلہ کی آکاس انسانی شخصیت کے شجرِ طیب پر نمایاں ہوتی اور آہستہ آہستہ عفت، عزت، ناموس، وفا و حیا اور غیرت و خودداری کے ہر احساس کو بالکل فنا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان خدا کی یاد اور نماز سے غافل ہو جاتا اور دوسروں کے ساتھ اخوت و محبت کے بجائے بغض و عداوت کے جذبات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.

(۵: ۹۰-۹۱)

”اے ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور تھان اور یہ قسمت کے تیر بالکل نجس شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمھارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز آتے ہو؟“

اس جوئے کے بارے میں ایک دل چسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام سے پہلے کے عرب معاشرے میں یہ امیروں کی طرف سے فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ اور غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ ان کے حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ جب سرما کا موسم آتا، شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو وہ مختلف جگہوں پر اکٹھے ہوتے، شراب کے جام لنڈھاتے اور سرور و مستی کے عالم میں کسی کا اونٹ یا اونٹنی پکڑتے اور اسے ذبح کر دیتے، پھر اس کا مالک جو کچھ اس کی قیمت مانگتا، اسے دے دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ اس طرح کے موقعوں پر غربا و فقرا پہلے سے جمع ہو جاتے تھے اور ان جوا کھیلنے والوں میں سے ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا، ان میں لٹاتا جاتا۔ عربِ جاہلی میں یہ بڑی عزت کی چیز تھی اور جو لوگ اس قسم کی تقریبات منعقد کرتے یا ان میں شامل ہوتے، وہ بڑے فیاض سمجھے جاتے تھے اور شاعر ان کے جود و کرم کی داستانیں اپنے قصیدوں میں بیان کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ ان تقریبات سے الگ رہتے انھیں 'برم' کہا جاتا تھا جس کے معنی عربی زبان میں بخیل کے ہیں۔

جوئے اور شراب کی یہی منفعت تھی جس کی بنا پر انھیں جب ممنوع قرار دیا گیا تو لوگ متردد ہوئے، لیکن قرآن نے صاف واضح کر دیا کہ ان کی یہ منفعت اپنی جگہ، مگر انسان کی شخصیت میں جو اخلاقی فساد ان سے پیدا ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کیے جا سکتے۔ ارشاد فرمایا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (البقرہ ۲:۲۱۹)

''وہ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے بہت زیادہ ہے۔''

سود

سود بھی ایک ایسی ہی اخلاقی نجاست ہے جس میں ملوث افراد اور ادارے اپنے اصل سرمائے کو بالکل بے داغ محفوظ رکھ کر اور کوئی جوکھم برداشت کیے بغیر منافع بٹانے کے لیے اپنے مقروض کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے 'ربٰو' کا لفظ مستعمل ہے۔ قرآن نے اس کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ عربی زبان سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد وہ معین اضافہ ہے جو قرض دینے والا اپنے مقروض سے محض اس بنا پر وصول کرتا ہے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہے۔ قرآنِ مجید نے اسے پوری شدت کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ
اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ
مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ
مِثْلُ الرِّبٰوا م وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ
الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط
وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (۲:۲۷۵)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو بالکل اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہو گا کہ انھوں نے کہا: بیع بھی تو آخر سود ہی کی طرح ہے اور تعجب ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ جس کو اس کے پروردگار کی یہ تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا، سو لے چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اب اس کا اعادہ کریں گے تو وہی اہل دوزخ ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسی سورہ میں آگے فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ج وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ
اَمْوَالِكُمْ ج لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ.
(۲:۲۷۸-۲۷۹)

”ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبر دار ہو جاؤ، اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔“

ان آیات میں سود خواروں کے قیامت میں پاگلوں کی طرح اٹھنے کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ نے بیع و شرا کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرا دیا ہے، دراں حالیکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب ایک تاجر اپنے سرمایے پر نفع لے سکتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایے پر نفع کا مطالبہ کرے تو وہ آخر مجرم کس طرح قرار پاتا ہے؟ قرآن کے نزدیک یہ ایسی پاگل پن کی بات ہے کہ اس کے کہنے والوں کو جزا اور عمل میں مشابہت کے قانون کے تحت قیامت میں پاگلوں اور دیوانوں ہی کی طرح اٹھنا

چاہیے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی سود خواروں کے اس اظہارِ تعجب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیامیں نئی نہیں ہے بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو..... لائق توجہ نہیں قرار دیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے، وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابل حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اول تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کر لے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتائیے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمن انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۶۳۲-۶۳۳)

سود کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر، بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الربوٰا سبعون حرباً ایسرھا ان ینکح الرجل امه. (ابن ماجہ، کتاب التجارات)

''سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو سب سے ہلکا حصہ اس کے برابر ہو گا کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

قرآنِ مجید نے اگرچہ سود لینے ہی کو حرام ٹھیرایا ہے، لیکن اس حرمت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ بغیر

کسی عذر کے اس کے کھانے اور کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں کو بھی تعاون علی الاثم کے اصول پر یکساں مجرم قرار دیا جائے۔ چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

لعن الرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربٰوا و موکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال: ھم سواء.(مسلم، کتاب البیوع)

''سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو سب سے ہلکا حصہ اس کے برابر ہو گا کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

اسی طرح مبادلۂ اشیا کی صورت میں ادھار کے معاملات میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہر آلایش سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الذھب بالذھب وزناً بوزن، مثلًا بمثل، فمن زاد و استزاد فھو ربا. (مسلم، کتاب البیوع)

''تم سونا ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی سونا لو، اسی وزن اور اسی قسم میں اور چاندی ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی چاندی لو، اسی وزن اور اسی قسم میں، اس لیے کہ جس نے زیادہ دیا اور زیادہ چاہا تو یہی سود ہے۔''

الورق بالذھب ربا الا ھاء وھاء والبر بالبر رباً الاھاء وھاء والشعیر بالشعیر رباً الاھاء وھاء والتمر بالتمر ربا الاھاء وھاء.(مسلم، کتاب البیوع)

''سونے کے بدلے میں چاندی ادھار بیچو گے تو اس میں سود آ جائے گا۔[۴۶] گندم کے بدلے میں دوسری قسم کی گندم،[۴۷] جو کے بدلے میں دوسری قسم کے جو اور کھجور کے بدلے میں دوسری قسم کی کھجور میں بھی یہی صورت ہو گی۔ ہاں البتہ یہ معاملہ نقدانقد ہو تو کوئی حرج نہیں۔''

ان روایتوں کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے اوپر اپنے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۴۶۔ یہ سدِ ذریعہ کی نوعیت کا حکم ہے۔ آپ نے اس اندیشے سے کہ معاملہ چونکہ ادھار کا ہے اور صنف کے اختلاف کی وجہ سے اس میں کمی بیشی تو بہر حال ہو گی، لوگوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔

۴۷۔ اس جملے کا عطف چونکہ 'الورق بالذھب' پر ہوا ہے جس میں صنف کا اختلاف بالکل واضح ہے، اس وجہ سے عربیت کی رو سے 'البر بالبر' میں پہلے 'البر' کے معنی، ظاہر ہے کہ دوسری قسم کی گندم ہی کے ہو سکتے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نے جو کچھ فرمایا، وہ یہی تھا۔ روایتیں اگر اسی صورت میں رہتیں تو لوگ ان کا یہ مدعا سمجھنے میں غلطی نہ کرتے، لیکن بعض دوسرے طریقوں میں راویوں کے سوء فہم نے ان میں سے دوسری روایت سے 'ھاء وھاء' کا مفہوم پہلی روایت میں، اور پہلی روایت سے 'الذھب بالذھب' کے الفاظ دوسری روایت میں 'الورق بالذھب' کی جگہ داخل کر کے انھیں اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ ان کا حکم اب لوگوں کے لیے ایک لاینحل معما ہے۔ ہماری فقہ میں 'ربوٰا الفضل' کا مسئلہ اسی غتربود کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح کر دی ہے کہ 'انما الربوٰا فی النسیئة'[۴۸] (سود صرف ادھار ہی کے معاملات میں ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سود کا تعلق صرف انھی چیزوں سے ہے جن کا استعمال ان کی اپنی حیثیت میں انھیں فنا کر دیتا اور اس طرح مقروض کو انھیں دوبارہ پیدا کر کے ان کے مالک کو لوٹانے کی مشقت میں مبتلا کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ عقل و نقل دونوں کی رو سے ظلم ہے، لیکن اس کے برخلاف وہ چیزیں جن کے وجود کو قائم رکھ کر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور استعمال کے بعد وہ جس حالت میں بھی ہوں، اپنی اصل حیثیت ہی میں ان کے مالک کو لوٹا دی جاتی ہیں، ان کے استعمال کا معاوضہ کرایہ ہے اور اس پر، ظاہر ہے کہ کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ قرض کسی غریب اور نادار کو دیا گیا ہے یا کسی کاروباری یا رفاہی اسکیم کے لیے اس چیز کو ربٰو کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ بات بالکل مسلم ہے کہ عربی زبان میں ربٰو کا اطلاق قرض دینے والے کے مقصد اور مقروض کی نوعیت و حیثیت سے قطعِ نظر محض اس معین اضافے ہی پر ہوتا ہے جو کسی بھی قرض کی رقم پر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بات خود قرآنِ مجید ہی نے واضح کر دی ہے کہ اس کے زمانۂ نزول میں سودی قرض زیادہ تر کاروباری لوگوں کے مال میں جا کر بڑھنے ہی کے لیے دیے جاتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ	''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ دوسروں کے مال میں پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم نے اللہ کی

۴۸۔ مسلم، کتاب البیوع۔

هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ.(الروم ۳۰:۳۹)

خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دی تو اسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھاتے ہیں۔''

اس میں دیکھ لیجیے 'لیربوا فی اموال الناس'(اس لیے کہ وہ دوسروں کے اموال میں پروان چڑھے) کے الفاظ نہ صرف یہ کہ غریبوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہیں، بلکہ صاف بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں سودی قرض بالعموم تجارتی مقاصد ہی کے لیے دیا جاتا تھا اور اس طرح قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق گویا دوسروں کے مال میں پروان چڑھتا تھا۔

یہی بات سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.(۲:۲۸۰)

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور اگر تم بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانہ نزول قرآن سے پہلے، جو سود رائج تھا یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربٰو قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھیرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا اس زمانے میں نہ تو دستور تھا نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذوعسرۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرۃ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوبِ بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مہلت دے اور اگر اصل میں معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ 'ان کان ذوعسرة فنظرة الی میسرة' (اگر قرض دار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'ان' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرض دار 'ذومیسرة' (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرض دار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔''

(تدبر قرآن، ج ۱، ص ۶۳۸-۶۳۹)

اس کے بعد انھوں نے اپنی اس بحث کا نتیجہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ظاہر ہے کہ مال دار لوگ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں کیا فرق ہوا؟''

(تدبر قرآن، ج ۱، ص ۶۳۹)

سود کی حرمت کا یہ حکم قرض لینے اور دینے میں منفعت کا کوئی محرک چونکہ کسی صورت میں باقی نہیں رہنے دیتا، اس وجہ سے اس کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ سرمایہ دار کی اعانت کے لیے قرض پر سرمایہ فراہم کرنے کا کوئی نظام کسی حال میں قائم نہیں ہو سکتا اور سرمایہ داری نظام کی عمارت بینکاری کے جس ستون پر کھڑی ہے، وہ ستون ہی اس طرح ڈھے جاتا ہے کہ کتاب الٰہی کی مراجعت کے سوا پھر اس کی تعمیر کی کوئی صورت اس زمین پر باقی نہیں رہتی۔

لیکن قومی بچت کی تنظیم پھر اس کے بعد کس طرح کی جائے؟ اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے:

'اولاً، یہ تنظیم 'کی لا یکون دولة' کے اصول پر نجی شعبے کے لیے بالکل ممنوع قرار دی جائے۔ تمام بنک بیت المال کی شاخوں میں تبدیل کر دیے جائیں اور لوگ ان میں اپنی جو بچت جمع کرائیں، اسے حفاظت، مبادلہ اور تھوڑی مدت کے قرضوں اور اس طرح کی دوسری سہولتوں کے ساتھ عند الطلب واپسی کے وعدے پر ایک وسیع تر قومی شعبے کی تشکیل میں صرف کیا جائے جسے ریاست اجتماعی ضرورتوں کے پیشِ نظر اپنی ترجیحات کے لحاظ سے اور اپنی منصوبہ بندی کے مطابق وجود میں لائے۔

ثانیاً، اس طریقے سے صنعت و حرفت کے جو ادارے اس شعبہ میں قائم کیے جائیں، ان کے قیام وانصرام اور ان کو چلانے کی ذمہ داری حکومت خود بھی قبول کرے اور جہاں مناسب ہو ان کے حصص کی ایک متعین مقدار نجی شعبہ کے ہاتھ فروخت کر کے ان کے نظم و نسق میں اسے بھی شریک کر لیا جائے یا ان پر خراج عائد کر کے انھیں اسی طرح نجی شعبہ کے حوالے کر دیا جائے، جس طرح سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں شام و عراق کی مفتوحہ زمینیں ریاست کی ملکیت قرار دے کر ان کے پرانے مالکوں ہی کے تصرف میں رہنے دیں اور ان کی پیداوار کے لحاظ سے ایک متعین رقم ان پر بطورِ خراج عائد کر دی۔

ثالثاً، بازارِ حصص کو جوئے اور ضرر و غرر پر مبنی سودوں کی لعنت سے پاک کر کے اس طرح منظم کیا جائے کہ لوگ نجی اور قومی شعبہ کے کاروباری منصوبوں میں بغیر کسی تردد کے حصہ دار بن سکیں۔

ان اقدامات کے نتیجے میں، یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا جدید معاشی نظریات کی پر پیچ راہوں سے نکل کر ٹھیک اس سواء السبیل کو پا لے گی، جہاں نہ سرمایہ داری کی لعنت باقی رہے گی اور نہ اشتراکیت کا ظلم و استبداد انسان کے تعاقب میں ہو گا۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معز امجد

التزامِ جماعت —— اعتراضات کا جائزہ

(۱)

مولانا گوہر رحمٰن صاحب کے اعتراضات

''الجماعۃ'' اور ''التزامِ جماعت'' کے مفہوم اور مصداق کے بارے میں ہماری رائے سے بعض اہلِ علم کو اختلاف ہے۔ مولانا گوہر رحمان صاحب نے اپنے مضمون، ''التزامِ جماعت'' (ماہنامہ ''فاران'' جون ۱۹۹۵) میں اپنی رائے تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ مولانا محترم کی رائے اور استدل کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

۱۔ امتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد ''اقامتِ دین'' یا بالفاظِ دیگر ''اظہارِ دین'' ہے۔

۲۔ امتِ مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد بھی ''اقامتِ دین'' اور ''اظہارِ دین'' ہی ہونا چاہیے۔ جو حکومت ''اقامتِ دین'' اور ''اظہارِ دین'' کا فریضہ انجام نہیں دیتی، وہ ''بالفعل'' تو حکومت ہوتی ہے، مگر ''بالحق'' حکومت نہیں ہوتی۔ حکومت بالفعل کے قوانین کی عام حالات میں اگرچہ پابندی کی جائے گی اور ایسا کرنا شرعاً ممنوع بھی نہیں ہے، تاہم ہر قائم ہو جانے والی حکومت کو ''الجماعۃ'' کہہ کر اس کے التزام کو دین کا تقاضا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ ایسا کرنا ''الجماعۃ'' کی اصطلاح کی توہین ہے۔ اگر ایسا ہو تو امریکہ اور برطانیہ میں قائم ہونے والی غیر مسلموں کی حکومتیں بھی ''الجماعۃ'' ہی قرار پائیں گی، جو بالبداہت غلط ہے۔

۳۔ قرآن و سنت سے منحرف حکومت کو بالحق حکومت نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ اسے مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ 'امرھم شوریٰ بینھم' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی جہالت، نادانی، فریب خوردگی، مفاد پرستی یا خود غرضی کی وجہ سے اگر قرآن و سنت سے منحرف حکومت کو منتخب کر لیا

ہو، تو وہ حکومت بالحق ہو جائے گی۔

۴۔ قرآن و سنت سے منحرف حکومت 'الطاغوت' ہے۔ قرآن نے 'الطاغوت' سے اجتناب کا حکم دیا ہے نہ کہ اس کے التزام اور اس سے وابستہ رہنے کا۔ ایسی حکومت کو ''الجماعۃ'' قرار دینا اور اس کے التزام کو لازم ٹھہرانا التزامِ طاغوت کے مترادف ہے۔

۵۔ بعض روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ امیر تمھیں پسند ہو یا ناپسند، اس کا حکم تمھاری رائے یا طبیعت و مزاج کے مطابق ہو یا نہ ہو، وہ تم پر دوسروں کو ترجیح دے رہا ہو یا تمھارے حقوق ادا نہ کر رہا ہو، جیسی بھی صورتِ حال ہو، تمھیں ہر حال میں اس کی اطاعت کرنی اور مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت کو نقصان پہنچانے سے باز رہنا ہے، تو اس کے معنی ایک تو یہ ہیں کہ ایسے امیر کے خلاف مسلح بغاوت نہ کی جائے، بلکہ دوسرے ذرائع سے اس کی اصلاح یا اس کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے، یہ روایات ایسی حکومت کے بارے میں ہیں، جو ملک کا نظام شریعت کے مطابق چلا رہی ہو اور اس میں قرآن و سنت کی بالادستی عملاً تسلیم کی جاتی ہو۔ تیسرے، اس مضمون کی احادیث کا تعلق ذاتی اور شخصی حقوق سے ہے، گویا ایسی احادیث سے مراد یہ ہے کہ جب ملک میں شریعت نافذ کرنے والا حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو، تو تم اس ظلم پر صبر کرو، اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

۶۔ حضرت حذیفہ بن یمان کی مشہور حدیث (جس میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ 'ان لم یکن لھم جماعۃ ولا امام') کے معنی یہ ہیں کہ جب بدعت و ضلالت کے غلبے کا دور آجائے اور ہر فرقہ، گروہ اور جماعت لوگوں کو اپنی طرف بلائے تو تم ائمہ بدعت و ضلالت میں سے کسی کی دعوت قبول نہ کرنا، کیونکہ یہ اسلام کے نام پر بدعت و ضلالت کی دعوت ہو گی۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کی اس جماعت کا التزام کرنا جو قرآن و سنت کا التزام کرنے والے امیر کی امارت پر مجتمع ہوں، چاہے وہ صالحیت اور صلاحیت کے اعتبار سے اپنے وقت کا معیاری مسلمان ہو یا اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی موجود ہوں۔ مگر جب تک اس حکمران نے 'الطاغوت' کی شکل اختیار نہ کی ہو اور قرآن و سنت سے منحرف نہ ہوا ہو، اس وقت تک اسی کا التزام کرنا دین کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر تم ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جاؤ کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظم درہم برہم ہو گیا ہو اور قرآن و سنت کی بالادستی قبول کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو، اور اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو قرآن و سنت کا التزام کرتی ہو اور تم اپنے اندر حالات کا تنہا

مقابلہ کرنے یااس مقصد کے لیے کوئی جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو، بلکہ تمھارے اپنے دین و ایمان کو خطرہ درپیش ہو، تو ایسے حالات میں اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے لوگوں سے الگ ہو کر، کسی محفوظ جگہ میں بیٹھ کر زندگی کے باقی دن پورے کرنا زیادہ بہتر ہے۔

۷۔ ''الجماعۃ'' سے مراد وہ حکومت ہے جو ''اقامتِ دین'' کا فرض انجام دینی ہو۔اس طرح ''التزامِ جماعت'' کا صحیح مفہوم اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ ''جماعۃ المسلمین'' سے مراد امتِ مسلمہ ہے۔احادیث میں ''الجماعۃ'' کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے، جو فکر و عمل کے اعتبار سے سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسول کا التزام کرتے ہیں۔

۸۔اگر اسلامی حکومت موجود ہی نہ ہو، تو پھر اس کے لیے منظم اور اجتماعی جد وجہد کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ جو جماعتیں ''اسلامی حکومت برائے اقامتِ دین'' کے لیے دین و شریعت اور سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسول کے اصول وہدایات کے مطابق کام کر رہی ہوں، ان میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو، اس میں شمولیت اختیار کرنا اور اس کے نظم کا التزام کرنا، جد وجہد برائے غلبۂ دین اور اقامتِ دین کا لازمی تقاضا ہے۔

یہاں ہم مولانا محترم کی ان آرا کا جائزہ لیں گے۔

۱۔امت کی تشکیل کا مقصد

مولانا محترم نے پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ امتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد ''اقامتِ دین'' اور ''اظہارِ دین'' ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''امتِ مسلمہ خود اللہ نے بنائی ہے اور اس کی فکری قیادت و امامت رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کا بے مقصد ہونا ناقابلِ تصور ہے۔ کسی جماعت کا مقصد وہی ہو سکتا ہے، جو اس کو وجود میں لانے والے نے متعین کیا ہو۔ اور اس جماعت کے ارکان کو اس مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے کا حکم دیا ہو۔اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو حکم دیا ہے، وہ یہ ہے ...۔''(ص ۲۲)

اس کے بعد مولانا محترم نے سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ نقل کی ہے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت میں 'لکم' کے مخاطب مسلمان ہیں، اور پوری امتِ مسلمہ ہے۔ ان کو مخاطب کر کے اللہ نے فرمایا ہے کہ تمھاری اس جماعت کا مقصدِ وجود وہی ہے جو انبیا علیہم السلام کا مقصدِ بعثت رہا ہے اور وہ ہے اقامتِ دین اور پھر حکم دیا ہے کہ اقامتِ دین کا فرض ادا کرتے رہو اور اس دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے

میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ رہو، اختلاف نہ کرو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو بلکہ سب مل کر دین کی اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو اس لیے کہ یہ اقامتِ دین تمھاری جماعت کے وجود کا مقصد ہے اور اپنے وجود کے مقصد میں افتراق و اختلاف کرنا ایک غیر معقول رویہ ہے...۔'' (ص ۲۲)

اس کے بعد مولانا محترم نے ''اقامتِ دین'' کے معنی کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پورے دین کو زندگی کا دستور العمل بناؤ۔ انفرادی زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور اجتماعی اور سیاسی شعبوں سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی اپنی اصلی حالت میں برقرار رکھو اور دفاعی و جہادی یا عدالتی و معاشرتی شعبوں سے متعلق احکام و قوانین کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور ان پر کماحقہٗ عمل درآمد کرو۔'' (ص ۲۳)

مولانا محترم کے اس نقطۂ نظر کا ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنے ایک مضمون[۱] میں جائزہ لیا ہے۔ اس میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قرآنِ مجید میں 'اقیموا الدین' کے الفاظ جن معنوں میں آئے ہیں، ان میں انھیں امتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سورۂ شوریٰ کی محولہ آیت کا موقع و محل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے امتِ مسلمہ یا اس کی نمائندہ حکومت کا مقصد قرار دیا جا سکے۔ ''اقامتِ دین'' کے ایک دینی فریضہ ہونے کے بارے میں ہم نے لکھا ہے:

''یہ بات بالکل واضح ہے کہ فرائضِ دین یا دینی فریضے کا اطلاق دین کے ایسے مشمولات ہی پر ہوتا ہے جن کا اہلِ ایمان کو اس طرح مکلف ٹھیرایا گیا ہو کہ انھیں بجالانے والوں کو اجر اور بغیر کسی عذر کے ترک کرنے والوں کو سزا ملے۔

...اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ فرائضِ زکوٰۃ کیا ہیں، تو اس کے جواب میں وہی چیزیں پیش کی جائیں گی، جو زکوٰۃ کے مشمولات میں سے ہیں اور جنھیں بجالانا ہر زکوٰۃ دینے والے کے لیے لازم ہے۔ اب کوئی شخص اگر یہ کہے کہ قرآنِ مجید نے ہمیں ایتاے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، اس وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنا بھی فرائضِ زکوٰۃ میں سے ہے، تو ظاہر ہے، اس کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ ایتاے زکوٰۃ، زکوٰۃ کے مشمولات میں سے ہے ہی نہیں، اس وجہ سے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ ''اشراق'' فروری ۱۹۹۶۔ اس مضمون کے بعد مولانا محترم کی طرف سے ہمارے اس مضمون کا جواب ماہنامہ ''فاران'' ستمبر ۱۹۹۶ میں شائع ہوا تھا۔ ''الجماعۃ'' پر اپنے اس مضمون کے بعد، ہم مولانا محترم کے اس جواب کا تجزیہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

اسے فرائضِ زکوٰۃ میں سے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو دراصل زکوٰۃ کے بارے میں ایک اصولی ہدایت ہے۔

...اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ جب مشمولاتِ دین کی حیثیت سے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہو گا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاے زکوٰۃ فرائضِ دین ہی قرار پائیں گے، لیکن جب فرائضِ صلوٰۃ یا فرائضِ زکوٰۃ کا ذکر کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ ان میں نماز اور زکوٰۃ کے مشمولات ہی کا ذکر ہو گا۔ لہٰذا جو شخص اقامتِ صلوٰۃ کو فرائضِ صلوٰۃ میں اور ایتاے زکوٰۃ کو فرائضِ زکوٰۃ میں شامل کرے، اسے یہ کہنا پڑے گا کہ صلوٰۃ کے مشمولات میں سے ایک چیز صلوٰۃ بھی ہے، جس کی اقامت، صلوٰۃ میں فرض ہے۔ اور زکوٰۃ کے مشمولات میں سے ایک چیز زکوٰۃ بھی ہے، جس کا ایتا، زکوٰۃ میں فرض ہے۔ اسی طرح، جو شخص ''اقامتِ دین'' کو دینی فریضہ قرار دے، اسے یہ بتانا پڑے گا کہ 'الدین' کے مشمولات میں سے ایک چیز، خود 'الدین' بھی ہے، جس کی اقامت 'الدین' میں فرض ہے۔

'أقيموا الدين' بے شک 'الدین' کے بارے میں ایک اصولی اور لازمی ہدایت ہے، مگر یہ ہدایت چونکہ 'الدین' کے مشمولات میں سے نہیں ہے، بلکہ خود 'الدین' کے بارے میں ہے، اس وجہ سے اسے فرائضِ دین میں سے ایک فریضہ کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' (ص ۲۶-۲۷)

''اقامتِ دین'' کے مفہوم کے بارے میں ہم نے لکھا تھا:

'أن أقيموا لدين ولا تتفرقوا فيه' کے معنی، ''اس دین پر پوری طرح قائم رہنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا'' کے ہیں۔ ان الفاظ میں نفاذِ دین یا اس کے لیے جدوجہد کا ہرگز کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی 'الدین' میں شامل ہے، اس پر بغیر کسی تفریق کے عمل کیا جائے، جو ماننے کی چیزیں ہیں انھیں مانا جائے، جو کرنے کی چیزیں ہیں انھیں کیا جائے، جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے باز رہا جائے۔ دین نے اگر عبادات کو کوئی حیثیت دی ہے تو اپنے عمل میں انھیں وہی حیثیت دی جائے۔ دین اگر کسی موقع پر جہاد کا تقاضا کرتا ہے تو اس تقاضے کو دل و جان کے ساتھ پورا کیا جائے۔ دین اگر سیاست، معیشت، معاشرت، حدود و تعزیرات، تبلیغ، خور و نوش اور آداب و شعائر کے بارے میں کچھ ہدایات دیتا ہے، تو ان ہدایات پر پوری طرح سے عمل پیرا رہا جائے۔ 'أقيموا الدين' کے یہی معنی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ 'الدین' اگر محض چند عقائد ہی کا مجموعہ ہوتا، تو اس صورت میں 'أقيموا الدين' کے معنی صرف ان عقائد کو ماننے تک محدود رہتے۔ 'الدین' اگر محض عبادات کا نام ہوتا، تو 'أقيموا الدين' کے معنی صرف ان عبادات کی پابندی کے ہوتے۔ 'الدین' اگر محض حلال و حرام کی ایک فہرست کا نام ہوتا تو 'أقيموا الدين' کا مفہوم ان حلتوں اور حرمتوں کی فہرست کی پابندی تک محدود رہتا۔ غرض کہ جو کچھ 'الدین' ہے 'أقيموا الدين' اس پورے

'الدین' پر ٹھیک ٹھیک عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے۔

'أقیموا الدین' کے صحیح معنی کی وضاحت کے بعد اب اس منطق پر بھی غور کر لیجیے کہ کسی موقع پر اگر مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی دین کے عملی نفاذ سے گریزاں ہو، تو 'أقیموا الدین' کے حکم کے تحت تمام مسلمان نفاذِ دین کی جدوجہد کے مکلف ہو جاتے ہیں۔

یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ 'الدین' میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہر شخص سے یکساں طور پر مطلوب ہیں۔ دوسری طرف 'الدین' کے کچھ تقاضے ایسے بھی ہیں، جو مثال کے طور پر وہ ایک مرد سے اس وقت کرتا ہے جب اسے شوہر کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کچھ تقاضے ایسے ہیں جو خاندان کے سربراہ کی حیثیت میں اس سے کیے جاتے ہیں۔ کچھ تقاضے ایسے ہیں، جو دین کے ایک داعی کی حیثیت میں اس سے کیے جاتے ہیں اور کچھ وہ بھی ہیں جو ریاست کے سربراہ کی حیثیت میں اس سے کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ایک غیر شادی شدہ آدمی کے لیے 'أقیموا الدین' کے تقاضوں میں، ایک شوہر اور خاندان کے سربراہ سے کیے جانے والے مطالبات شامل نہیں ہوں گے اور نہ شادی کرنے کی جدوجہد ہی 'أقیموا الدین' کا تقاضا قرار پائے گی، اسی طرح ایک عام آدمی سے 'أقیموا الدین' کا نعرہ لگا کر وہ تقاضے نہیں کیے جا سکتے جو 'الدین' میں اصلاً ایک ریاست کے سربراہ سے مطلوب ہیں۔ نفاذِ دین سربراہانِ کار کی ذمہ داری ہے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ چیز بھی 'أقیموا الدین' کے تقاضوں میں شامل ہے۔ ہم یہاں اس بات سے تو تعرض نہیں کریں گے کہ اگر ریاست کے اہلِ اقتدار اپنی یہ ذمہ داری ادا نہ کریں تو عام آدمی سے دین کیا مطالبہ کرتا ہے، البتہ اتنی بات بالکل واضح ہے کہ 'أقیموا الدین' میں 'أقیموا' کا فعل ہر گز یہ تقاضا نہیں کرتا کہ امت کا ہر فرد نفاذِ دین کی جدوجہد شروع کر دے۔ 'أقیموا الدین' کے معنی بس یہی ہیں کہ ہر شخص وہ تمام تقاضے پورے کرے جو 'الدین' اس سے کرتا ہے اور ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ کرے۔ اس کے معنی ہر گز یہ نہیں ہیں کہ معاشرے کا کوئی فرد یا گروہ، اگر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوتاہی کر رہا ہے اور اس طرح 'أقیموا الدین' کی ہدایت پر عمل نہیں کر رہا ہے، تو پوری امت کے ایک ایک فرد سے، اس مخصوص گروہ کی ذمہ داریاں ادا کرنا یا اس کی جدوجہد کرنا بھی 'أقیموا الدین' میں فعل 'أقیموا' کے استعمال سے ایک مطالبہ بن جائے گا۔''

(ص ۱۷-۱۹)

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ 'أقیموا الدین' کے معنی، اصل میں یہ ہیں کہ جو کچھ 'الدین' ہے، اس

پر پوری طرح سے عمل در آمد کیا جائے۔ اس کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اس کے تمام اوامر کو بجالایا جائے اور اس کی تمام نواہی سے گریز کیا جائے۔ یہ دراصل وہی ہدایت ہے، جو تورات میں ان الفاظ میں مذکور ہوئی ہے:

"سو تم احتیاط کر کے ان سب آئین اور احکام پر عمل کرو، جن کو میں آج تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جب تک تم دنیا میں زندہ رہو، تم احتیاط کر کے انھی آئین اور احکام پر اس ملک میں عمل کرنا، جسے خداوند تیرے باپ دادا کے خدا نے تجھ کو دیا ہے۔" (استثنا، باب ۱۲، آیت ۱)

ظاہر ہے کہ اللہ کا سارا دین یہ تقاضا لے کر آتا ہے کہ اس کے تمام احکام و قوانین پر عمل پیرا رہا جائے۔ دین کے تمام احکام میں یہ بات آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے کہ لوگ ان کو مانیں، ان کے آگے سرِ تسلیم خم کریں اور ان کے مطابق اپنے علم و عمل کی اصلاح کریں۔ اس وجہ سے کسی حکم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "اس حکم کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں"۔ مثال کے طور پر، یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ نماز کے حکم کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے پروردگار کی یاد قائم رکھیں، مگر یہ کہنا ایک بے معنی بات ہو گی کہ نماز پڑھنے کا حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نماز پڑھیں۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ دین دینے کا "مقصد" یہ نہیں ہو سکتا کہ لوگ دین پر عمل کریں۔ یہ بات تو خود دین دینے کے عمل ہی میں مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت دی ہے تو ہدایت دینے کے اس عمل ہی کا تقاضا ہے کہ اس ہدایت کے مطابق اپنے علم و عمل کی اصلاح کی جائے۔ گویا "اقامتِ دین" یا دین پر بے کم و کاست عمل کرنا، دراصل پروردگارِ عالم کی بندگی کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ یہ دین دینے کا مقصد ہے اور نہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا۔ چنانچہ ہم نے اپنے مضمون میں اسی بات کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 'أقیموا الدین' کے وہ معنی ہی نہیں ہیں، جو مولانا محترم بیان فرما رہے ہیں۔ اس ساری تفصیل کے بعد مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور امتِ مسلمہ کے وجود کا جو مقصد بیان فرمایا ہے، اس کی تردید کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ 'أقیموا الدین' کے صحیح معنی سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی اسے بعثتِ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام اور وجودِ امتِ مسلمہ کا مقصد قرار نہیں دے سکتا۔" ("اشراق" نومبر ۱۹۹۶، ص ۲۵)

مولانا کے نزدیک "اقامتِ دین" کی طرح "اظہارِ دین" بھی امتِ مسلمہ کے وجود کا مقصد ہے۔ "اظہارِ دین" کا مفہوم واضح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"امتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد غلبۂ دین کے لیے جہاد کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس کے نبی کی نبوت کا مقصد یا اس کی علت اور حکمت غلبۂ دین ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ورسالت کی علت وحکمت ..... خود اللہ تعالیٰ نے متعین طور پر بتا دی ہے۔" (ص ۲۴)

اس معاملے میں مولانا کا استدلال قرآنِ مجید کی درجِ ذیل آیت پر مبنی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (التوبہ ۹: ۳۳)

"وہی ذات ہے، جس نے اپنی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اپنا رسول بھیجا ہے، تاکہ وہ تمام ادیان پر اسے غالب کر دے۔ اگرچہ ان مشرکوں کے لیے یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

آیۂ "اظہار دین" کے مفہوم اور اس کے بارے میں مولانا محترم کی رائے کا تجزیہ ہم اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں۔[۲] وہاں ہم نے اس آیت کے پس منظر، اس کے موقع و محل، اس کے سیاق و سباق اور اس کے جملوں کے در و بست کے لحاظ سے اس کے صحیح مفہوم کو واضح کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری پوری بات کا خلاصہ اس طرح ہے:

"آیۂ "اظہارِ دین" میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ بیان ہوا ہے کہ مشرکینِ عرب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، رسولوں کے باب میں پروردگارِ عالم کی غیر متبدل سنت کے مطابق، اللہ کا دین سرزمینِ عرب کے تمام ادیان پر لازماً غالب آئے گا۔ اس لحاظ سے، یہ آیت ہمارے نزدیک، رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے متعلق ہے۔ چنانچہ، اللہ کے آخری رسول کے بعد، اب اس کا اطلاق، ہمارے نزدیک، کسی شخص، جماعت، گروہ یا امت کی جدوجہد پر نہیں ہوتا۔" (ص ۴۸)

یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ قرآنِ مجید میں انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا کیا مقصد بیان ہوا ہے۔ تاہم اتنی بات "اقامتِ دین" اور "اظہارِ دین" کے مفہوم ہی سے واضح ہے کہ انھیں انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ مولانا گوہر رحمٰن صاحب کی بات جس مقدمہ پر مبنی ہے —— یعنی یہ کہ امتِ مسلمہ کی تشکیل کا مقصد "اقامتِ دین" اور "اظہارِ دین" ہے —— وہی ہمارے نزدیک محلِ نظر ہے۔

(جاری)

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ "اشراق" نومبر ۱۹۹۶۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

خواب میں ڈر جانے کی دعا

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَةِ مِنْ غَضَبِه وَ عِقَابِہٖ، وَ شَرِّ عِبَادِہٖ وَ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنَ وَ اَنْ یَحْضُرُوْنَ.

میں اللہ تعالیٰ کے کلماتِ کاملہ کی پناہ میں آتا ہوں اس کے عتاب اور اس کے عذاب سے، اس کے بندوں کے شر اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس سے کہ یہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

'کلمات' سے یہاں مراد اللہ کے احکام ہیں، جن کے صادر ہوتے ہی کلمۂ کن کی طرح ان کے نتائج کا ظہور ہو جاتا ہے۔ یہ کلمات ظاہر ہے صفاتِ الٰہی کا مظہر ہوتے ہیں۔ کلمات سے جس صفت کو قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کی صفتِ قدرت ہے۔ یعنی اس کی قدرت ایسی کامل ہے کہ بس کہہ دینے سے کام ہو جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ میں اللہ کی ناراضی اور اس کے عذاب سے اس کی مخلوقات اور شیاطین کے شر سے تیری صفتِ قدرت کے مظہر تیرے کلمات کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔

کلمات کی پناہ اور مدد، دراصل، سب سے زیادہ سریع ہے۔ جس ذات کو خود اٹھ کر مدد کے لیے آنا پڑے۔ اور اس مدد کے لیے سب اینٹ روڑہ پتھر اسے خود اکٹھا کرنا پڑے۔ تو جتنی دیر میں وہ ذات مدد کو پہنچے گی اتنی دیر میں شیاطین اپنا کام کر چکے ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر کسی ذات کو بس حکم کے دو بول بولنا پڑیں اور دنیا کے سارے اسباب اس کے بجا لانے کو اٹھ کھڑے ہوں، تو ظاہر ہے اس کی پناہ بروقت ہوگی اور زیادہ قوی اور محکم بھی ہوگی۔ اسی پہلو سے اللہ کے کلمات کی پناہ مانگی گئی ہے۔

یہاں جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ان میں سب سے بڑی چیز اللہ کی ناراضی اور اس کا عذاب ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات کا یہ ڈراؤنا خواب کہیں اللہ کی ناراضی کا اظہار نہ ہو۔ اس لیے اے اللہ میں اس موقع پر تیری پناہ چاہتا ہوں۔ جس طرح کے کلمات سے تو نے یہ خواب کا حکم جاری کیا ہے اسی طرح کے کلمات سے اب مجھے اس کے شر سے بچانے کے لیے بھی حکم جاری فرما، تاکہ خواب کے لیے جاری ہونے والے پہلے الفاظ کی اثر پذیری سے پہلے پہلے مجھے تیری پناہ حاصل ہو جائے۔

اللہ کی طرف سے کسی مشکل اور خوف و جوع کی آزمایش آتے دیکھ کر اسی سے پناہ طلب کرنا اور اس کے سوا کسی اور کے پاس نہ جانا یہی اللہ کو حقیقی معنی میں الٰہ ماننا ہے۔ یہی ایمان کی معراج ہے۔

صفاتِ الٰہی کا ناقص علم آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ مشکل آئی ہے تو یقیناً اللہ مجھ سے ناراض ہے۔ اسے راضی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی سے سفارش کرائی جائے۔ چنانچہ وہ دوسروں کے دروازوں پر جا کر ماتھا ٹیک دیتا ہے۔ اس دعا میں اس کے برعکس ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کو ناراض پا کر اسی کی پناہ ڈھونڈو تاکہ وہ راضی ہو اور اپنی آزمایش کو ٹال دے۔

دعا کے آخر میں شیطان کے ہمزات سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ہمزات سے مراد شیطانی اشارے اور وسوسے ہیں۔ اور اس سے عام ہو کر یہ شیطان کی طرف سے آنے والے ہر خطرے کے معنی میں استعمال ہو جاتا ہے۔ دعا کا یہ آخری جملہ بعینہٖ قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ وہاں یہ دعا حصولِ صبر اور کفار کے برے سلوک کے جواب میں درگزر کرنے کی تلقین کے لیے اتری ہے۔ شیاطین سے جیسے کہ ہم ان دعاؤں میں مسلسل دیکھتے چلے آ رہے ہیں، جن و انس کے شیاطین مراد ہیں۔ ہمزات کے طرز کے وسوسے اگرچہ انسان بھی دلوں میں ڈال دیتے ہیں مگر یہ عمل زیادہ تر شیاطینِ جن ہی کا حربہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شیاطین مجھے ایسے خوابوں سے ڈرا کر کہیں شرک کی طرف نہ لے جائیں۔

'وان یحضرون' سے مراد انسان ہیں۔ جو آدمی کے پاس آ کر اسے شر و فساد پر ابھارتے، حق کے بارے میں اس سے حجت کرتے اور اس کو فساد کے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ خواب میں جس شخص سے بیان کروں وہ کہیں مجھے سمجھا بجھا کر غلط راہوں پر نہ ڈال دے کہ اس خواب کے شر سے بچنے کے لیے یوں اور یوں کر لو، تو وہ بلا ٹل جائے گی جو خواب میں آ کر تنگ کرتی ہے یعنی اے اللہ، ایسے لوگوں کو میرے پاس نہ بھیج جو مجھے راہِ مستقیم سے ہٹا دیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

لیلۃ القدر پانے پر دعا

اللّٰھُمَّ إنَّکَ عَفُوٌّ ، تُحِبُّ الْعَفْوَ، فَاعْفُ عنِّی.

اے اللہ تومعاف فرمانے والا ہے، معاف کرنے کو پسند فرماتا ہے، اس لیے مجھے معاف فرما۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پالوں تو اللہ سے کیا طلب کروں۔ جس کے جواب میں آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ دعا سکھائی۔

یہ مغفرت کی دعا ہے۔ اس اہم رات میں اگر کوئی دعا مانگی جا سکتی تھی تو یہی تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کو لے کر آئے اس نے اگر کوئی انقلاب برپا کیا تھا تو یہی تھا کہ خواص سے لے کر عوام تک سب کو ایک ہی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ ہم قیامت کے عذاب سے بچ جائیں۔ بدو بھی رسالت مآب کی خدمت میں آتے تو یہی کہتے کہ ہمیں بس اتنا دین بتا دیجیے جو ہمیں دوزخ سے بچا لے اور جنت میں لے جائے۔

چنانچہ اس رات میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ دعا کرنا کہ حکومتِ مدینہ مستحکم ہو جائے یا پورا دین نافذ ہو جائے یا فلاں کافر پر عذاب نازل ہو جائے۔ بلکہ آپ نے یہ سکھایا کہ اگر یہ اہم رات پاؤ تو اپنی مغفرت کی دعا کرو۔

دعا کے الفاظ غایت درجہ التجا اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جو اپنے پہلو میں ایک مؤدبانہ استدلال بھی لیے ہوئے ہے کہ اے اللہ تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے اس لیے مجھے معاف فرما۔ یہ وہی استدلال ہے جس میں ہم دوسرے کے پسندیدہ طریقے یا رویے کا حوالہ دے کر اسے قائل کرتے ہیں۔

التجا کا مفہوم، اس میں اللہ کی صفت 'عفو' پر 'تحب العفو' کے عطف سے پیدا ہوا ہے جس سے تکرار سی

پیدا ہو گئی ہے۔ تکرار کا اسلوب تاکید و اصرار کے ساتھ ساتھ لجاجت اور التماس کے معنی بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس دعا کے چھوٹے چھوٹے جملوں، عفو کی تکرار اور بالخصوص 'ف' اور 'ن' جیسے خوش آواز حروف کی مناسب وقفوں کے ساتھ آمد نے اس میں ایک صوتی آہنگ پیدا کر دیا ہے، یہ آہنگ کلام کی تاثیر میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے۔ ایسے کلام اپنی تاثیر کے باعث یوں محسوس ہوتا ہے کہ دل کے نہاں خانوں سے زبان پر جاری ہو گئے ہیں۔ دعائیہ اسالیب میں اس آہنگ کا ایک خاص محل ہے۔ اس اعتبار سے یہ دعا اپنے اندر بے پناہ ادبی محاسن رکھتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

شکایت

ہمیں دوسروں سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی لفظوں کے تیر و نشتر ہمیں مجروح کرتے، کبھی کسی کا رویہ دیکھ کر ہم دکھی ہو جاتے اور کبھی کسی کا اقدام ہمیں مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ہم انسان ہیں۔ ہم لطیف احساسات رکھتے ہیں۔ چنانچہ معاملہ صرف اس طرح کی انتہائی صورتوں ہی کا نہیں ہے بلکہ بعض اوقات کسی کی معمولی سی بے اعتنائی، بے رخی اور بے توجہی بھی ہمیں دکھی کر دیتی ہے۔ اس معاملے میں اس وقت صورتِ حال اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے، جب ہم کسی سے توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور ہماری وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ انسان امیدوں کے سہارے جیتا ہے۔ جب امیدیں بر نہ آئیں تو سینے بھنچ جاتے اور آنکھیں بہہ نکلتی ہیں۔

ہم اگر اپنے دفتر، خاندان اور دائرۂ احباب میں موجود تلخیوں کا تجزیہ کریں تو ان کے اسباب میں اسی طرح کی باتیں اور عوامل کارفرما نظر آئیں گے۔ اس تلخی کا سب سے زیادہ اظہار بیوی اور شوہر کے تعلق میں ہوتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی صورت جوان اولاد اور والدین، ماتحت اور افسر اور اسی طرح لیڈر اور اس کے پیرووں میں موجود رہتی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچے، بیوی، ماتحت اور پیرو عام طور پر شکایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں دیکھیے اپنی مظلومیت کا رونا روتے ہیں۔ اپنی نیکی، محبت اور خیر خواہی کا راگ الاپتے ہیں۔ اپنے ہر ہر ایثار کی داستان سناتے ہیں۔ ''اُس'' کے مظالم بیان کرتے ہوئے گلوگیر ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلمی کہانی کے ولن کی طرح، شوہر، افسر یا لیڈر ظلم کا پتلا ہے۔ نہ اسے دوسرے کی ضروریات کا احساس ہے، نہ وہ خیر خواہی پر ممنون ہے اور نہ وہ جذبات ہی کا قدر شناس ہے۔

ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خطاب فرمایا۔ آپ نے کہا: میں نے جہنم میں عورتیں

زیادہ دیکھی ہیں۔ خواتین نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے بتایا کہ تم اپنے شوہروں کو بہت زیادہ ملامت کرتی رہتی ہو۔ تمھارا یہی رویہ اس انجام کا باعث ہے۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ صدقہ کیا کرو۔

اس خطاب میں مخاطب عورت تھی۔ لہٰذا اسی کی ایک کمزوری کے حوالے سے اسے تنبیہ کی گئی۔ لیکن آپ کے اس ارشاد سے اگر اصولی بات اخذ کی جائے تو وہ ہر اس فرد پر منطبق ہوتی ہے، جو کسی نہ کسی صورت میں دوسرے کے ماتحت یا تابع ہے۔ اگر معاشرے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام روش ہے۔ 'نیکی برباد گناہ لازم' ہماری زبان میں ایک ضرب المثل کی حیثیت سے رائج ہے۔ زبان میں کوئی جملہ اسی صورت میں یہ حیثیت اختیار کرتا ہے جب اس میں ایک مانی ہوئی بات بیان کی گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں جب بھی کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم اس کی نیکیوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔

غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رویے کا باعث ان خوبیوں، احسانات اور عنایات کی ناشکری ہے، جن کا تناسب بالعموم بے توجہی، ناانصافی اور زیادتی سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ یہی بتایا ہے کہ زیادہ عورتوں کے جہنم میں جانے کا باعث ناشکری ہے۔ لیکن کیا وہ ماتحت اس وعید کے مخاطب نہیں جو جا و بے جا شاکی رہتے ہیں۔ وہ پیرو نہیں جو اپنے لیڈروں کو کوستے رہتے ہیں۔ وہ بچے نہیں جو اپنے والدین کی زندگی بھر کی عنایتوں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ دوست نہیں جو اپنے احباب کے ساتھ گزرے ہوئے اچھے وقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہم میں سے ہر فرد ماتحت بھی ہے، بالا بھی اور رفیق بھی۔ ہمیں دوسرے کی اصلاح کرنی ہے، مگر شکر گزاری کے ساتھ۔ ہم شکایت کر سکتے ہیں، مگر جذبۂ خیر خواہی کے تحت۔

رپورتاژ

طالب محسن

پرستش

(باباگورونانک کے یومِ پیدایش کی تقریب کے مشاہدے پر ایک تاثر)

بروقت پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ لیکن یہ کیا، موٹر سائیکل کا انجن بند ہو گیا۔ اسے میرا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے سوچا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ اس کا پلگ صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ پلگ صاف کیا، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس تک جانے کا عمل پھر سے شروع ہو گیا۔ میں بوڑھا، میری موٹر سائیکل بوڑھی، وہ جوان اس کی موٹر سائیکل جوان، وہ مینارِ پاکستان کے دروازے پر کھڑا تلملا رہا ہو گا — کسی کا کسی کو پانا اتنا آسان نہیں ہے۔

ہمیں مل کر وہاں جانا تھا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔

ایک مذہبی رہنما کا جنم دن، لوگ عقیدت سے سرشار، جذبۂ عبادت سے بے خود، اس کی گلی میں برہنہ پا، اس کے حضور سر فگندہ۔

مجھے ایک مذہب بیزار مفکر کا قول یاد آیا: مذہب انسان کے دورِ توہم پرستی کی باقیات میں سے ہے۔ اصل ضرورت اصلاحِ نظام کی ہے۔ لہٰذا خدا کا مذہب وہی ہو سکتا ہے جس میں ایک ترقی یافتہ فلاحی ریاست کے لیے بہترین اصول اور اعلیٰ نظام تجویز کیا گیا ہو۔ یہ عبادت: یہ پوجا و پرستش کی رسوم، محض تاریک زمانوں کی یادگاریں ہیں۔ میں نے سوچا: کتنی عقل کی بات ہے۔

لیکن یہ انسان کیا ہے، نرا بے عقل۔ یہ بتوں کے معبد، یہ قربان گاہیں، یہ کلیسا، یہ صوامع، یہ مساجد، یہ

زمین پر ٹکی ہوئی پیشانیاں، یہ جھکی ہوئی کمریں، یہ اٹھے ہوئے ہاتھ، یہ اشک بار آنکھیں.....

کہاں کائنات کی تسخیر کا عزم اور کہاں یہ توہم پرست پجاری، کہاں سعی و جہد پر اعتماد اور کہاں یہ مذہب کا افیون۔

میں نے دل سے پوچھا۔ دل اس کی یاد پر دھڑکا۔ پیشانی سے دریافت کیا۔ وہ اس کے آگے جھکنے کے لیے بے تاب۔ ہاتھ کشکول بننے کے لیے بے چین۔ زندگی اس کی مرہون۔ اس کے سہارے کی طالب۔ لفظوں نے کہا: ہم اس کی حمد کا نغمہ ہیں۔ آنسو بولے: ہم اس کی مغفرت کے ہرکارے ہیں۔ میں نے سوچا: یہ تو عبادت ہے، پرستش ہے۔

معبدوں کے پجاری بولے: اسی میں زندگی ہے۔

قرآن نے کہا: 'وقضی ربك ان لا تعبدوا الا ایاه' (اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

منظر بدل گیا۔ معبدوں کی جگہ مسجد نے لے لی۔ مؤذن کہہ رہا تھا:

'اشهد ان لا اله الا الله' (میں اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رپورتاژ

محمد بلال

''اپر کلاس'' کی باتیں

پچھلے دنوں میرا گیارہ ماہ کا پہلا اور اکلوتا برخوردار، اسد اللہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ واکر (walker) سمیت ۱۶ زینوں کی سیڑھی سے گر گیا تھا۔

میں دفتر میں تھا۔ ٹیلی فون پر اس حادثے کی اطلاع ملی۔ خبر سنتے ہی میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ فوراً دفتر سے نکلا۔ پریشانی کے عالم میں تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ اسد کو دیکھا۔ وہ گم سم لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب چوٹ لگی ہوئی تھی، جسے دیکھتے ہی میرے دل کو چوٹ لگی۔ اس کا سہا ہوا چہرہ مجھے طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں لے کر اس کا دل لبھانے کی کوشش کی۔ جس چیز کو حاصل کر کے وہ خوش ہوتا تھا وہ چیز اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ جن باتوں سے وہ محظوظ ہوتا تھا وہ باتیں کرنا شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، لیکن اس کا چہرہ اپنی روایتی بشاشت سے ابھی تک عاری تھا اور اس کی زبان اپنی روایتی چہچہاہٹ سے تاحال محروم تھی۔ یکایک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اسد کو اپنے نانا (اسحاق ناگی صاحب) سے اور ناگی صاحب کو اپنے اس اکلوتے نواسے سے بڑی محبت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی صحبت سے خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ ناگی صاحب کی داڑھی اسد کے ننھے ننھے ہاتھوں کے لحاظ سے شہ مشت برابر ہے۔ اور اس کے نزدیک ان کی داڑھی کی حیثیت ایک کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ وہ بڑی مہارت سے ان کی گھنی داڑھی کا ایک بال پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اکھیڑ دیتا ہے اور ناگی صاحب جیسے

مرد آزما کو چیخ مارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور نانا جی بھی ایسے ہیں جو اس تکلیف سے لذت اٹھاتے ہیں اور ایک مزے دار حکایت کی طرح یہ بات دوسروں کو سناتے ہیں۔ ناگی صاحب کا گھر ہمارے گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔ میں فوراً اسد اور اس کی پریشان ماں کو لے کر ان کے گھر چلا گیا۔

ناگی صاحب نے اسد کی آنکھ کے قریب چوٹ کا نشان دیکھا۔ وجہ پوچھی۔ وجہ بتائی گئی۔ انھوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے۔ اتنے زینوں والی سیڑھی سے گرنے کے بعد یہ (معمولی) چوٹ آئی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ صدقہ خیرات کریں۔ شکرانے کے نوافل ادا کریں۔ اللہ نے اسے دوسری زندگی دی ہے۔

ناگی صاحب کی بات سن کر میری اندرونی کیفیت فوراً بدل گئی۔ یکایک میرے اندر شکر خداوندی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ خدا کی طرف دھیان گیا تو ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکنیں پھر سے بحال ہو گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اسد کی بشاشت اور چہچہاہٹ لوٹ آئی اور وہ اپنے روایتی اور معصومانہ ''شر و فساد'' میں مصروف ہو گیا۔

علمی اعتبار سے ناگی صاحب کی بات میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اللہ کے فضل سے میں رجائی نقطۂ نظر کا حامل آدمی ہوں اور ہر زحمت میں رحمت کا پہلو دیکھنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں۔ موسیٰ و خضر کا واقعہ بالعموم پیش نظر رکھتا ہوں اور عیب دار کشتی میں ایک محفوظ کشتی دیکھتا ہوں۔ لیکن اُس موقع پر میرے اوپر ایک خاص جذباتی کیفیت طاری تھی جس نے مجھے اپنا ہی ایک زاویۂ نگاہ بھلا دیا تھا۔

اُس وقت ناگی صاحب نے دراصل میرے لیے ایک مذکر کا کام کیا۔ یعنی ایک مانی ہوئی لیکن بھولی ہوئی بات کی یاددہانی کا کام۔

دین سے متعلق مناسب معلومات رکھنے والے بعض لوگ دینی مجالس میں شریک نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ حالانکہ دینی مجالس کا بنیادی کام دین سے متعلق معلومات فراہم کرنا نہیں، بلکہ بھولے ہوئے اور مانے ہوئے حقائق کو یاد دلانا ہوتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس یاددہانی کا انسان بڑا محتاج ہے۔

اُس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ جب انسان پر جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس موقع پر بالعموم مذہبی اعتبار سے علم و عقل کو بروے کار نہیں لاتا۔ حالانکہ آزمایش کے پہلو سے یہی تو وہ وقت ہوتا ہے جب اس صلاحیت کو استعمال کرنا چاہیے۔

اُس موقع پر زاویۂ نگاہ کے ایک خاص پہلو کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اگر میں دینی مزاج کا حامل شخص نہ ہوتا تو

اس حادثے کے باعث بہت دیر تک اعصابی تناؤ کا شکار رہتا۔ یہ ایک نقطۂ نظر ہی تھا جس نے فوراً مجھے اس تناؤ کے عذاب سے نجات دلادی۔

مادی سوچ کے غلبے کے باعث آج دنیا میں انسانوں کو ان کی مالی پوزیشن کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اپر کلاس، مڈل کلاس، لوئر کلاس جیسے الفاظ اسی پہلو سے زبان زد عام ہیں۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ انسانوں کو مالی لحاظ سے اپر (upper) یا لوئر (lower) قرار نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے کہ مال و دولت اور اسباب و وسائل اکثر و بیشتر انسان کو ورثے یا قسمت سے ملتے ہیں۔ اس معاملے میں صلاحیت اور محنت کا دخل کم دیکھنے میں آتا ہے، بلکہ اگر صلاحیت اور محنت سے بھی یہ چیزیں حاصل ہوں تب بھی ان کی حقیقت میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ میرے نزدیک جو شخص حیات و کائنات کے اعلیٰ حقائق کا جتنا زیادہ سمجھا ہوا ہے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق جتنا زیادہ ڈھالا ہوا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اپر (upper) ہے۔ اور جو شخص اس معاملے میں جتنا زیادہ کم فہم اور بے عمل ہے وہ اتنا ہی زیادہ لوئر (lower) ہے۔ اس لیے کہ یہ فہم اور عمل ـــــ جو ایک دن مادی پہلو سے بھی بے پناہ نفع بخش ثابت ہو گا ـــــ انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ اس معاملے میں پہلا قدم انسان ہی اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد خدا اس کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ میں چونکہ اس نقطۂ نظر کا حامل ہوں اس لیے جب اُس وقت ناگی صاحب کا خیال آیا تو سوچا کہ ''اپر کلاس'' کے لوگوں سے تعلق کتنا سود مند ہے۔ اگر اس صورت حال میں ''لوئر کلاس'' سے متعلق کسی آدمی سے سابقہ پیش آتا تو عین ممکن تھا کہ وہ اس انسانی اور زمینی واقعے کو انسان اور زمین تک ہی محدود رکھتا اور اس کا خدا اور آسمان کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہ کرتا۔ چنانچہ اس وقت مجھے ''اپر کلاس'' کے ساتھ اپنے نسبت ناتے پر فخر محسوس ہونے لگا۔

اس واقعہ کے بعد جب ناگی صاحب کی میرے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے علیک سلیک کے بعد انھیں کہا: مبارک ہو! اللہ نے اسد کو دوسری زندگی دی ہے۔

''اپر کلاس'' کی باتیں، اپر کلاس ہی ہوتی ہیں۔ ''لوئر کلاس'' سے متعلق لوگ ایسے موقعوں پر مبارک باد نہیں دیا کرتے۔ وہ عیب دار کشتی کے عیب ہی پر نگاہ رکھتے ہیں اور شکوے، شکایتیں اور افسوس ہی کرتے رہتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید

O

جب دیکھتا ہوں شوخیِ رنگِ چمن کو میں
ہر گل میں دیکھتا ہوں ترے بانکپن کو میں

ہوتا ہے روز راہ کے کانٹوں سے تار تار
سیتا ہوں اُن کی نوک سے پھر پیرہن کو میں

عالم کو اپنے ذوق سے بے گانہ دیکھ کر
خلوت میں لے گیا ہوں تری انجمن کو میں

قلب و نظر ہیں ذوقِ تمنا سے بے نصیب
لاؤں کہاں سے اب ترے عہدِ کہن کو میں

دختِ فرنگ ، تیری اداؤں میں بے حجاب
اے کاش ، دیکھتا نہ ترے مکر و فن کو میں

ہر شخص کو ہے بزم میں ظاہر سے التفات
باہم کروں کہاں ترے روح و بدن کو میں ؟

رخشِ حیات ، دیکھیے جا کر تھمے کہاں
یزداں کو دیکھتا ہوں ، کبھی اہرمن کو میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس دشتِ بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

اپنی خوشی سے بارِ امانت اُٹھا لیا
اب کیا کہوں کہ بار ہیں، رنج و محن کو میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com